"قومی تہذیب اور ہندستانی مسلمان" سیریز — ۵

علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ

عابد رضا بیدار

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

ایک عزیز یاد

شوپیان کے کشمیری دوست اور علی گڑھ کے ساتھی

ایم - اے - حمید کے نام

فہرست :

یونیورسٹی اور علی یاور، جنگ

چو از قومے یکے بے دانشی کرد ؛ نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

اپریل ۶۵ء میں یہی ہوا۔ مسلمانوں کی عزیز ترین درسگاہ میں پہلی بار باپ نے بیٹوں سے نفرت کا چلن چلایا، اور بیٹوں نے باپ پر ہاتھ اٹھایا۔ (جو اٹھنے سے پہلے ٹوٹ کیوں نہیں گئے!) نفرت صرف نفرت ہی کو جنم دے سکتی ہے اس لئے انتقام کا ہدف پھر یونیورسٹی تھی جس کی عزت و آبرو پانچ سال تک پامال ہوتی رہی اور ایمرجنسی کا جو باب ۶۵ء میں کھلا وہ آج تک اسی طرح وا ہے۔

یہ ۶۵ء کا حادثہ اس طور پر ہوا کہ جانے والے وائس چانسلر طیب جی نے یونیورسٹی میں ٹیکنیکل تعلیم کے لئے، داخلوں میں ۷۵ فی صدی نشستیں خود اپنے طلبہ کے لئے مخصوص کر دی تھیں اور اس بہانے مسلمان طلباء کی ایک بڑی تعداد ایک محفوظ روزگار کے وسیلے کو حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ نواب علی یاور جنگ نے چارج سنبھالنے کے فوراً بعد ایک اقدام یہ کیا کہ محفوظ نشستوں کی تعداد ۷۵ سے ۵۰ کر دی۔ کوئی ایسی خامی نہ تھی۔ تھی بھی، تو ایسی یقیناً نہ تھی کہ بڑے چھوٹے کے سارے آداب طاق میں رکھ دیے جائیں۔ لیکن اس بیچ میں کچھ ایسی فضا بنتی گئی جس میں نواب صاحب طلباء کو ایک اہم ملی ستون کی بجائے سرکاری آدمی زیادہ نظر آنے لگے اور یہ تاثر عام ہوتا گیا کہ ان کا مشن علی گڑھ کو ہندیانا ہے۔ اور علی گڑھ کی تمت؛ کوئی بڑی سے بڑی گالی اتنی سخت نہیں لگتی جتنی یہ "انریمنٹ آؤٹ پوسٹ آف اسلام" کی بات۔ نتیجہ ۶۵ء کا حادثہ تھا۔ جس کے بعد یونیورسٹی بحق سرکار ضبط ہوئی۔ اس زمانے میں کس نے کیا کہا، میں نے اسے ایک دستاویزی لڑی میں پرونے کی کوشش کی ہے۔

آرڈیننس کے ساتھ سرکاری اعلانیہ (۱۲ مئی)

سرکاری ذرائع کے مطابق حالانکہ بظاہر حالیہ ایجی ٹیشن داخلہ کے قوانین میں مجوزہ تبدیلیوں کے خلاف تھا، لیکن کافی شہادتیں حاصل ہوگئی ہیں کہ دراصل یہ ایجی ٹیشن نئے وائس چانسلر مسٹر علی یاور جنگ کے خلاف تھا، جو یونی ورسٹی کے مسائل کے سلسلہ میں بہت ہی وسیع النظر اور قوم پرستانہ رویے رکھتے تھے۔

یونی ورسٹی کے ڈسپلن اور کارکردگی کو چند غیر صحت مندانہ اثرات تباہ کر رہے تھے۔ نظم و نسق مکمل طور پر بے کار اور ناقابل اعتماد ہو چکا تھا۔ تمام تقرریاں فرقہ وارانہ لحاظ سے ہوتی تھیں۔ اس طرح کی نہایت ہی محفوظ طور پر فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر کی اقلیت یونی ورسٹی کے روزمرہ کے کاموں میں اثر ڈال رہی تھی۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی پاکستان کے لئے نہایت ہی ہنرمند ڈاکٹروں، انجینیروں کو مہیا کرنے کے لئے ایک 'بھرتی' کا مرکز بن گئی تھی اور پاکستان کی حمایت میں سرگرمیوں کے لئے بھی ایک سرگرم مرکز تھی۔

معیارِ تعلیم پست ہوتا جارہا تھا اور طلبہ حکام کے ساتھ ڈسپلن اور احترام نہیں برتتے تھے۔ باہر کی طاقتیں انھیں فرقہ وارانہ منافرت پر اکسا رہی تھیں جس سے یونی ورسٹی کا تعلیمی ماحول مسموم ہو کر رہ گیا تھا۔"

کرنل بشیر حسین زیدی (بیان ثانی ۔ ۲۳ مئی)

آرڈیننس کا مقصد یونی ورسٹی کے انتظامیہ کو بہتر بنانا ۔ اور وائس چانسلر کو تھوڑے سے طلبا اور اساتذہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے با اختیار بنانا ہے جو یونی ورسٹی کی زندگی پر غیر صحت مند اثرات مرتب کرتے رہے ہیں۔ یونیورسٹی میں بد انتظامی اور ابتری کے سبب اس کے نارمل انتظام کو عارضی طور پر معطل کرنے کا یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ جب رحمت اللہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کو استعفیٰ دینا پڑا تھا اور مسٹر راس مسعود کو وائس چانسلر مقرر کیا گیا تھا اُس وقت انھیں خصوصی اختیارات دیے گئے تھے اور یونیورسٹی کے نارمل انتظام کو معطل کر دیا گیا تھا۔

مجھے اس بات سے انتہائی تکلیف پہنچتی ہے کہ جب کبھی مسلمانوں کے کسی سیکشن کے خلاف فرقہ پرستی یا رجعت پسندی کی شکایت ہوتی ہے۔ ملک کے بہت لوگ فوری طور پر ان مسلمانوں کو الزام دینا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ پاکستان کے ایجنٹ ہیں، اور ہندستان کے مفاد کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ یو.پی اسمبلی کے ایک ممبر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مسلم یونی ورسٹی بم تیار کر رہی ہے، جو پاکستان کو بھیجے جاتے ہیں، اور پاکستانی فوج ان کو کچھ میں استعمال کر رہی ہے۔

یہ خبر بھی بڑے پیمانہ پر پھیلائی گئی کہ ۲۵ اپریل کے واقعہ سے ایک دو روز قبل پاکستانی ہائی کمیشن کا ایک افسر مسلم یونی ورسٹی گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ آج کے اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر مجھے صدمہ ہوا اور حیرت ہوئی کہ سرکاری حلقے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یونیورسٹی میں کچھ فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر نے اس کو پرو پاکستان

سرگرمیوں اور پاکستان کے لئے انجنیروں اور ڈاکٹروں کی بھرتی کا سرگرم مرکز بنا دیا ہے ...... بعض لوگ دوسروں کو بکنامی کی موت مارنے میں لیس و پیش نہیں کرتے۔ مجھے توقع ہے کہ حکومت اس قسم کا رویہ اختیار کرنے کے لئے قصوروار نہیں بنے گی!

چھاگلہ جی کا بیان، سید محمود کے بیان پر (۲۴ مئی)

ایک بیان میں وزیر تعلیم نے ضمنی طور پر اس بات کی تردید کی کہ انھوں نے کبھی بھی یہ کہا کہ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پاکستان حامی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ مسٹر چھاگلہ نے کہا کہ ۳ مئی کو لوک سبھا میں انھوں نے صاف صاف یہ کہا تھا کہ "مجھے اس بات کی کوئی اطلاع نہیں کہ علی گڑھ میں پاکستان کے سلسلے میں جلسے ہوئے"،

انھوں نے اس پسے منظر کا تذکرہ بھی کیا ہے جو اخبارات میں علیگڑھ کے بارے میں آرڈیننس کے اجرار کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ انھوں نے کہا یہ بیانات ان کی منظوری سے شائع نہیں ہوئے۔ اور علی گڑھ کے بارے میں صحیح صورت حال سے عدم واقفیت کی بنا پر جاری کئے گئے اور صحیح صورت حال انھوں نے راجیہ سبھا میں بیان کر دی تھی۔

چھاگلہ جی بنام مولانا اسعد مدنی (۲۷ مئی)

"کیمپ بمبئی، ۲۳ مئی: ......

میں نے کسی عدالتی تحقیقات کو مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ جو حقائق مختلف

ذرائع سے میں نے جمع کیے ہیں، میرے لیے وہ اطمینان بخش تھے .....

جب میں نے مسلم یونیورسٹی کے واقعہ کو فرقہ وارانہ کہا تھا تو میں نے اس بات کو پوری طرح واضح کر دیا کہ ان الفاظ سے میرا مطلب یہ تھا کہ ہندو طلبا یا ہندو جنتا کے خلاف جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں صرف اس حقیقت پر زور دے رہا تھا کہ علی گڈھ یونیورسٹی میں ایک ایسا رجعت پسند عنصر موجود ہے جو جدید اور قومی نظریات کے حامل نئے وائس چانسلر کی تقرری کے خلاف تھا مجھے یقین ہے کہ ایک ایسا فرقہ پرست عنصر علی گڑھ میں موجود ہے اور یہ علی گڈھ یونیورسٹی کے حق میں ہوگا کہ ایسے عنصر کو ان تمام اثرات سے محروم کر دیا جائے جو وہ یونیورسٹی کی انتظامیہ پر رکھتا تھا۔ جو آرڈیننس جاری کیا گیا، زیادہ تر اسی نظریے کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

..... یہ بات بالکل جھوٹی اور الزام تراشی ہے کہ میں کسی طرح بھی مسلم کلچر کی برقراری اور ترقی کا مخالف ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلم کلچر علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں فروغ پائے۔ کوئی الگ تھلگ نہیں، بلکہ ہندستانی قومیت کے جامہ میں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ہندستان اور ساری دنیا کو یہ دکھانا ہے کہ ہندستان کی تاریخ میں مسلم کلچر کا کیا حصہ رہا اور اس کلچر کی حفاظت کس قدر اہم ہے۔"

نواب علی یاور جنگ (۲۱ رمئی)

آرڈیننس جاری ہونے کے سلسلہ میں بعض اخبارات میں لگائے جانے والے ان الزامات سے مجھے بہت تکلیف پہنچی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پاکستان

یاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی ہے اور یہاں کے انجینیرنگ اور میڈیکل فیکلٹیوں کے
اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے افراد پاکستان میں ملازمت اختیار کرتے ہیں۔ میں
ان شرارت آمیز الزامات کی کھلم کھلا تردید کرنا ضروری تصور کرتا ہوں۔

ہماری یونیورسٹی کے کچھ لوگ پاکستان یا دوسرے ملکوں کو چلے گئے ہیں
تو اس کا سبب غالباً روزگار کے مواقع کی کمی ہے۔ روزگار کے مواقع کی اسی
کمی کے باعث دوسرے لوگ بھی ملک کے باہر روزگار تلاش کرتے پائے گئے ہیں
اور اسی وجہ سے بیرونی ملکوں میں بعض ہندستانی طلبا، خواہ وہ کسی بھی فرقے
سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں، دوسرے ملکوں میں ملازمت کو ترجیح دیتے ہیں
یہ ایک ایسا رجحان ہے جس کے لئے صرف علی گڑھ کو مورد الزام ٹھہرانا غلط ہوگا۔

غلطی انسان سے ہو سکتی ہے اور اہم امور میں اختلاف رائے بھی ہو سکتا
ہے..... خدا کے فضل سے اب مجھے یقین ہوتا جارہا ہے کہ وہ خطرہ جو اس
حادثے سے علی گڑھ کو پیدا ہوگیا تھا وہ اب دور ہوتا جارہا ہے، اور مجھے اطمینان ہے
کہ علی گڑھ کی اساس قائم رہے گی۔

..... میری یہاں پہ حاضری اور اس آستانہ پر دعا تیس سال سے میرا
مشرب رہی ہے۔ اس موقع پر اس سے بہتر کیا دعا مانگ سکتا ہوں کہ خدا دلوں
میں صفائی پیدا کرے، حالات کو پھر مساعد کردے اور علی گڑھ ایک ترقی پذیر ہندستانی
قومیت کے اندر ایسے علمی مدارج کو پہنچے جو ہندستان اور ہندستانی مسلمانوں کے لئے
مایۂ ناز ہو اور ایک طرف دین کی پرستاری اور دوسری طرف وطن کی وفاداری قائم رہے۔

(آستانہ نظام الدین اولیا پر ایک اجتماع سے خطاب)

ڈاکٹر گوپال سنگھ ایم۔ پی (۲۸، مئی)

"ان دنوں ہندستان کے اندر کچھ لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جن کو ہر بات میں پاکستان کی سازش نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس کا مشاہدہ ابھی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے حالیہ حادثہ میں ہوا۔ مسلم یونیورسٹی کا ایک واقعہ خاص نوعیت کا تھا جس کا کسی دوسری جگہ سے کوئی تعلق نہیں، لیکن ان واقعات کو زیادہ سنگین ظاہر کرنے کے لئے خواہ مخواہ پاکستان کو گھسیٹ لیا گیا۔

جو حادثہ ابھی حال میں ہوا وہ بہت افسوسناک ہے لیکن اس مسئلہ کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس معاملہ کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے اور صرف ان لوگوں کو سزا ملنی چاہیے جو صحیح معنی میں قصوروار ہوں۔

"مسلم یونیورسٹی علیگڈھ جو اسلامی تہذیب کا مرکز بتائی جاتی ہے، اس کے اسلامی کیرکٹر کو بدلنا نہیں چاہیے۔ اسلام نے دُنیا کی تہذیب میں ایک نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کے مطالعہ کے لئے ہندستان کی ہر بڑی یونیورسٹی میں خاص شعبہ کھولا جانا چاہیے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو تو خاص طور پر اس کا مرکز رہنا چاہیے۔"

ظ۔ انصاری

دونوں باتیں خلافِ معمول تھیں: طالب علموں کا وائس چانسلر پر حملہ آور ہونا، اور وائس چانسلر کی طرف سے مسلح پولیس طلب کیا جانا۔ اور ان کا نتیجہ بھی شرمناک نکلا۔ یہ یونی ورسٹی ہمارے ملک کا صرف اعلا تعلیمی ادارہ نہیں، بلکہ ایک تہذیبی مرکز ہے۔ اس میں ہر فرقہ اور مذہب کے طالب علم اور اُستاد شروع سے آج تک رہے ہیں۔ ادارے کے بانی سر سید احمد خاں ضرور تھے، لیکن اُنھیں غیر مسلم دوستوں سے بھی بڑی مدد ملی۔ ہر زمانہ میں ملک کے بہترین اہلِ علم کا لہو پسینہ اس کے بنانے میں صرف ہوا، اور آج حکومتِ ہند اور دوسرے غیر ملکی اداروں سے اتنی زبردست امداد یونیورسٹی کو ملتی ہے کہ انگریزی سرکار نے اُسے زرِ خرید بنا کر بھی نہیں دی تھی۔

طالب علموں میں ۳۰ سے ۳۵ فی صدی تک غیر مسلم طلبا اور اُستاد موجود ہیں، غیر ملکوں کے طالب علم اور اُستاد بھی ہیں۔ ہندی اور سنسکرت کے الگ الگ ڈیپارٹمنٹ قائم ہیں۔ انجنیئرنگ کالج اور دوسرے ٹیکنیکل اداروں میں اکثریت ہندستانی مسلمانوں کی نہیں ہے۔ پھر بھی اگر یہ یونی ورسٹی "مسلم" کہلاتی ہے تو اس لئے کہ پچھلی صدی کے غیرت مند مسلمانوں نے اسے بنایا تھا، ہندستانی

مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کا ذہنی مرکز بھی نہیں رہا ہے اور ان کی علمی اور سوشل زندگی کے رشتے بھی یونی ورسٹی سے وابستہ ہیں۔ جب کہیں مسلمان بچوں کو داخلہ نہیں ملتا تو وہ جذباتی طور پر اسی یونی ورسٹی سے آس لگاتے ہیں۔ یہاں پلے نتے ہیں۔ پچھلے سال ایسے ۳۷ طالب علم داخلے سے مایوس ہو کر واپس گئے۔

بد زبان اور کم ظرف لوگوں نے اپنے اخباروں میں، اور قانون ساز مجلسوں میں جتنا کچھ نپکارا، اس کی اہمیت کچھ نہ تھی اگر خود وزیر تعلیم چھاگلہ جی نے یہ دھمکی نہ دی ہوتی کہ یونیورسٹی میں فرقہ پرستی کا زور رہے اور اس کا آئین معطل کر دیا جائیگا۔

چھاگلہ جی دوسرے ماحول میں پلے ہیں، انھیں واقعات کے قانونی اور عقلی پہلو پر عبور رہے لیکن معاملات کے جذباتی، نفسیاتی اور تاریخی پہلو بھی ہوتے ہیں، اور بعض اوقات وہی فیصلہ کن ہو جاتے ہیں، اگر یہ یونی ورسٹی اس معنی میں "کمیونل" ہے جس میں ہم نے ذکر کیا، تو اسے اتنا "کمیونل" رہنا چاہیئے۔ اس سے ہمارے جہان دیس کے سیکولرزم کو کسی طرح کا اندیشہ نہیں۔ اگر وہ اس معنی میں "کمیونل" ہے کہ یہاں کے گریجویٹ روٹی روزگار کی تلاش میں پاکستان کی طرف نکل جاتے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ تمام ملک کے بہت سے لائق طالب علم باہر کی طرف دیکھتے ہیں تعلیم کے دوران بھی، اور تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد بھی!

ایک غیر ملکی حکومت نے گریجویٹوں کو تعلیمی وظیفے دینے کا اعلان کیا تو ۳۳ ہزار درخواستیں پہنچیں۔ اور ایک ملک کی طرف سے چند سال کے لئے علمی خدمات حاصل کرنے کا اعلان ہوا تو ہزارہا درخواستوں اور سفارشوں کا انبار لگ گیا۔

بعض لوگ ایسے جنھیں چھاؤنی میں آنا نصیب نہ ہوا تھا اپنے ذرائع سے گھس گئے

وہاں نوکری کرنے آ گئے۔

ایک دو نہیں ہزاروں مثالیں ایسی ہیں کہ ہندستان کے گریجویٹوں اور نوجوان ماہرین نے یہاں تعلیم حاصل کی اور مغربی ملکوں میں پہونچ کر نوکری کر لی۔ یہاں آئے، مایوسی لے کر گئے اور وہیں شہریت قبول کر کے بیٹھ گئے۔

مسلمان گریجویٹوں یا ماہرین کو پاکستان میں نوکری کسی قدر آسانی سے مل جاتی ہے، اس لئے تن آسان لوگ دوڑے ہوئے اُدھر جاتے ہیں۔

جب ہم اپنے مُلک کی ذہانتوں کو دُور دراز مغربی ملکوں سے نہیں بُلوا سکتے تو مسلم یونیورسٹی سے ہر سال فارغ ہونے والے سو پچاس لڑکوں کو اچھے کیریر کی کیا گارنٹی دے سکتے ہیں۔ ؟ اور گارنٹی نہیں تو طعنہ کس بات کا ؟

چھاگلہ جی کتنے ہی لائق و فائق سہی، یہ اُن کے بس سے باہر ہے کہ وہ یونیورسٹی توڑ دیں یا اس کا آئین ہی معطل کر دیں۔ وہ کچھ ضروری ترمیمیں کر سکتے ہیں۔ انقلاب نہیں لا سکتے۔ انقلاب لانے کا حق اُسے ہے جو اس ادارے کے رگ و ریشہ سے واقف ہو اور دل و جان سے وابستہ۔ چھاگلہ جی نے یہاں تک بیان دے ڈالا کہ وائس چانسلر کو قتل کر کے ایک تابوت میں رکھ لے جانے کا انتظام لڑکوں نے کر رکھا تھا۔ یہ قتل کی سازش تھی۔ بمبئی کے اس ماہر قانون کو علی گڑھ کے لڑکوں کی زندہ دلی اور شرارتوں کا علم نہیں ہے غالباً۔ وہاں الیکشن ہار جانے والے فریق کا فرضی جنازہ نکالتے ہیں اور ایسے ایسے جُملے کستے ہیں کہ جیتنے والا تو کیا ہارنے والا بھی ہنستے ہنستے لوٹ جائے گا۔ لڑکوں نے اسی طرح کا جنازہ تیار کیا ہوگا۔

حملہ وائس چانسلر پر ہوا۔ عدالتی تحقیقات چل رہی ہے، ہم رائے زنی

نہیں کر سکتے۔ ورنہ کچھ بھنک ہم کو بھی ملی ہے کہ اس کے پیچھے کس جذبے کا ہاتھ تھا۔ فرقہ واری کا تو بہر حال نہیں تھا، ورنہ اس کے کیا معنی کہ لوٹوں، اینٹوں اور چھپر کھٹ کے ڈنڈوں سے حملہ کرنے والوں میں ہندو مسلم طلبا شریک تھے دونوں کے نام لیڈروں میں بتائے جاتے ہیں۔

لڑکوں کا ابتدائی مطالبہ یہ تھا کہ یونی ورسٹی کے طالب علموں کو اعلیٰ فنی کالجوں اور اداروں میں ۷۵ فیصدی داخلے دیے جائیں۔ ذاکر صاحب اور زبیدی صاحب کے زمانے میں بھی یہ مطالبہ تھا، پورا نہ ہوا تو قیامت نہ آگئی۔ بدرالدین طیب جی نے اسے پورا کر دیا تو اس سے خاص علی گڑھ کے رہنے والے ہندو مسلم طالب علموں کو فائدہ ہوا، باہر کے مسلمان طالب علموں کو نقصان۔ پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ مسلمان طالب علم اپنے داخلوں کا کوٹہ کم کرانے کے لئے مار پیٹ شروع کر دیں، ضرور کہیں ذاتی پرخاش کا ہاتھ ہے جو ایک دن کھلے گا!

طالبعلم بہکاوے میں آگئے اور پھر پولیس دیکھ کر مشتعل ہو گئے۔ اب ٹھنڈے ہوئے تو اپنے کیے پر شرمندہ۔ یہ واقعہ ایک سبق بن جائے گا، طلبا اور صاحبانِ اقتدار دونوں کے لئے۔

حیات اللہ انصاری

مسلم یونیورسٹی آج کل جس گہن میں گرفتار ہے آج تک ایسے گہن میں کبھی نہیں آئی۔ یونیورسٹی میں پولیس بلائی گئی، پھر اس نے فائرنگ کی، جس میں دو طالب علم زخمی ہوئے۔ پھر طالب علموں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا، جتنا آجتک

نہیں کیا تھا، یعنی وائس چانسلر کو زدوکوب کیا۔ اس کے بعد وزیر تعلیم نے تحقیقات سے پہلے ہی یونیورسٹی کے بارے میں اپنا فیصلہ سُنا دیا اور تحقیقات سے پہلے ہی آرڈیننس نافذ کر کے یونیورسٹی میں عظیم تبدیلیاں کر دیں۔ یہاں تک کہ اس کی بڑی جمہوری اور تنظیمی جماعت کو بھی ختم کر دیا۔ اب یونیورسٹی ایک طرح کا سرکاری محکمہ ہے جس کے افسرِ اعلیٰ اگرچہ نام کے لئے صدر جمہوریہ ہیں، لیکن عملی طور پر وزیر تعلیم شری چھاگلہ ہیں۔

جو لوگ اس بات کی سنگینی کو کہ طالب علموں نے وائس چانسلر پر ہاتھ اٹھایا کسی طرح گھٹانا چاہتے ہیں، وہ بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں، اگر ایسی بات کم سنگین سمجھی جانے لگے تو پھر ہندستان میں اور خاص کر مسلمانوں میں جو بزرگ خاندان کا ادب ہے وہ کم ہو جائے گا۔ لیکن اسی طرح جو لوگ دوسری باتوں کو ہلکا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ بھی کچھ کم غلطی کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں کیوں کہ ان بری باتوں میں ہر ایک بات اپنی جگہ پر ایسی ہے کہ کوئی ملکی وقار کو گراتی ہے تو کوئی ملی وقار کو۔ کوئی جمہوری حقوق پر ضرب لگاتی ہے تو کوئی یونیورسٹی کی خودداری کو مجروح کرتی ہے۔

...... یہ واضح رہے کہ مسلم یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی ہی رہے گی، اور خصوصی طور سے مسلمانوں کی تعلیمی اور دنیاوی ترقی کے لئے جدوجہد کرے گی، یہ چیز اس سوال سے قطعی خارج ہو جاتی ہے کہ اس یونیورسٹی کو ہندستان کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح بنا دیا جائے۔

علی گڑھ کالج سے لے کر مسلم یونیورسٹی کے قیام تک اور یونیورسٹی کے قیام سے آج تک اولڈ بوائز کا اتنا بڑا اجتماع کبھی منعقد نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے یہ چیز

صرف مسلم یونیورسٹی ہی کی تاریخ میں نہیں، ہندستان کی تاریخ میں ایک انوکھی چیز ہے۔ کیونکہ کسی اور یونیورسٹی میں ایسے اجتماع کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ کسی جگہ بھی اولڈ بوائز اتنے منظم اور اپنی مادر جامعہ سے وابستہ نہیں ہیں کہ اس طرح اکٹھا ہوسکیں۔

.... اگر آج سر سید زندہ ہو جائیں تو وہ اپنی یونیورسٹی کے اولڈ بوائز کو کیا مشورہ دیں گے! ..... سر سید یقینی طور پر یہی کہتے کہ اس یونیورسٹی کا جو مقصد کل تھا وہ آج بھی ہے۔ اگر کل وہ انگلستان اور ہندستان کے درمیان پل بنانا چاہتی تھی تو آج وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پل بنانا چاہتی ہے اور جس خود اعتمادی کی وجہ سے ان کو اس وقت یہ اندیشہ نہیں ہوا تھا کہ مسلمان انگریز بن جائیں گے، اسی خود اعتمادی کی وجہ سے ان کو یہ اندیشہ نہیں ہوگا کہ مسلمان ھندو بن جائیں گے۔

.... مسلم یونیورسٹی پاکستان کے دوستوں کا گڑھ ہے — مسلم یونیورسٹی مُسلم فرقہ واریت کا ہندستان میں اڈا ہے۔ جب تک مسلم یونیورسٹی کے بارے میں یہ دو بدگمانیاں باقی ہیں، اس کی زندگی بے مصرف ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں یونیورسٹی کے فارغ طالب علموں کو فوج میں جگہ ملنے کا کیا سوال، معمولی سرکاری دفتروں میں بھی جگہ نہ مل سکے گی۔ بلکہ غیر مسلم نجی کارخانوں اور دفتروں کے مالک بھی (ان) کو اپنے یہاں ملازم نہیں رکھیں گے..... یونیورسٹی کے خلاف بدگمانیوں کو کیسے دُور کیا جائے؟ یہ بہت بڑا سوال ہے۔ بدقسمتی سے وزیرِ تعلیم چھاگلہ صاحب نے کچھ بیان ایسے دے دیے ہیں، جن سے ان بدگمانیوں کو دس گنی طاقت مل گئی ہے۔

ابوالحسن علی ندوی

اگر مسلم یونیورسٹی پر مسلمانوں کا حق باقی نہیں رہتا اور وہ اپنے مذہب اور اپنے کلچر کے مطابق اس کو چلانے کے حق سے محروم کردیئے جاتے ہیں تو پھر ہندستان میں وہ کون سی جگہ ہوسکتی ہے، جس کی طرف اشارہ کرکے بتایا جائے کہ یہاں اقلیت کو اپنے مذہب اور کلچر کی حفاظت کی آزادی ہے۔

ہندستان کے دستور میں دیے ہوئے اس حق کو کہ اقلیتیں اپنی مرضی کی درسگاہ قائم کر سکتی ہیں کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی مسترد نہیں کرسکتی۔ کسی دستور کا ضامن اس ملک کا ضمیر ہوتا ہے، جس کے پیچھے لاکھوں کروڑوں شہریوں کی آواز ہوتی ہے۔ اگر کوئی دستور جھوٹا ثابت ہوا تو پوری قوم جھوٹی سمجھی جائے گی۔

سیّد محمود

میں آپ کو ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ کل کے نمائندہ اجتماع میں یہ طے ہوا تھا کہ میں پرائم منسٹر سے وقت لے کر اُن کے سامنے یہ مسئلہ پیش کروں۔ پرائم منسٹر بڑے مصروف شخص ہیں، لیکن اس کے باوجود کمال مہربانی سے اُنھوں نے آج ایک گھنٹہ دیا اور میں نے پوری طرح آپ کے جذبات ان تک پہنچا دیے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ ضرور دیکھیں گے کہ کوئی غلط بات نہ ہو۔

میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ آپ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیجیے

اور جسٹس کیو ایا کسی اور سے قانونی انکوائری کرائیے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملہ کو دیکھیں اور امید تو ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کریں گے۔ میں نے ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ بھی ان کو بتادی۔ ۱۹۰۰ء اس لئے کہ یہ وہ تاریخ ہے جب میں علی گڑھ میں داخل ہوا تھا اور اس کے بعد سے برابر اس سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہا ہوں۔ میں واقف ہوں کہ وہ کیا ہے۔ اتنے طویل عرصے تک علی گڑھ سے وابستہ کوئی شخص یہاں تو ہے نہیں، میں زندہ رہ گیا ہوں۔ میں کیوں زندہ ہوں، میں نہیں جانتا۔ شاید یہ موقع دیکھنے کے لئے کہ علی گڑھ پہ یہ وقت بھی آئے۔

آج نیشنلزم کا بڑا چرچا ہے۔ یہ نیشنلزم جو آپ سُن رہے ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد کی پیداوار ہے۔ آج جو بڑے بڑے نیشنلسٹ ہیں، وہ کل کیا تھے، وہ مسٹر جناح کے ساتھی تھے۔ کل انھوں نے کمیونلزم کے نام پر علی گڑھ کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی تھی۔ آج وہی کام وہ نیشنلزم کے نام پر کرنا چاہتے ہیں۔

علی گڑھ کی نیشنلزم تو آپ مجھ سے پوچھیں۔ میرے ساتھیوں میں تصدق شروانی، بجنوری وغیرہ تھے۔ خفیہ سوسائٹی بنی تھی، جس کا بڑا اڈہ ہو گیا تھا اور جو انگریزوں کو نکالنے کی تدابیر سوچتی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں گوکھلے کو محمد علی جب لے گئے تھے تو ان کی گاڑی کو گھوڑوں کے بجائے طلبا نے کھینچا تھا۔ اور جب وہ اس طرح یونیورسٹی پہنچے اور وہاں اُترے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انھوں نے محمد علی سے کہا "I shall now die a happy man"

پھر ۱۹۰۷ء کی اسٹرائک ہوئی۔ انگریزوں کے خلاف۔ پھر ۱۹۲۰ء میں

آدھے سے زیادہ طلبا نے رہنماؤں کی آواز پہ لبیک کہہ کر ایک نئی قومی یونیورسٹی کی بنا ڈال دی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ گاندھی جی اس تحریک کے لئے بنارس نہیں گئے بلکہ علی گڑھ گئے تھے، کیونکہ علی گڑھ پر ان کا اعتقاد تھا۔ پھر، ۴۷ تک جنھوں نے قومی تحریک میں نام پیدا کیا ان مسلمانوں میں ایک بڑی اکثریت علی گڑھ والوں کی ہے۔ فرقہ پرستی بھی وہاں رہی مگر بڑے معمولی عرصے کے لئے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور تھا، جب وہ اسی رو میں بہے۔ مگر پھر ذاکر صاحب ان کے بعد طیب جی تک یونیورسٹی کا پرانا انداز ابھر آیا۔ مسٹر چھاگلہ نے نامعلوم کمیونلزم کہاں سے دیکھ لیا۔ مسٹر ہماتی کمیشن نے یہ نہیں کہا جو چھاگلہ صاحب نے کہا۔ یہ مسلمانوں کی توہین ہے۔ ان پر بغاوت کا الزام ہے اسے ہم برداشت نہیں کریں گے۔ مجھے کبھی بلڈ پریشر نہیں ہوا۔ لیکن اس دن جب مسٹر چھاگلہ نے تقریر کی، میرے ساتھ ایک اور بڑے آدمی پر اس کا دورہ ہو گیا۔

مسلمان ایجوکیشن منسٹر کے مسلم یونیورسٹی پر ایسے بیانات، اور ان کے بعد آرڈیننس آنے سے ہندو شریف لوگ بھی مشتبہ ہونے لگے مسلمانوں کی طرف سے یہ کیسی غیر دانشمندانہ بات ہے۔ اور نیشنلزم کیا آرڈیننس سے پیدا ہوتا ہے؟ نیشنلزم کہیں مارنے سے پیدا ہوتا ہے؟ نہرو کے الفاظ میں ایسے حالات پیدا کرو، جو خود بخود نیشنلزم پیدا کر دیں۔ اور دیکھئے تو، کون آدمی نیشنلزم پیدا کرنے والا ہے جو، ۴۷ء کے بعد سے خود نیشنلسٹ بنا ہے۔ جب ہم آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے اُس وقت مسٹر چھاگلہ عدالت کی کرسی پر ہمارے

بارے میں انگریزوں کی چشم ابرو پر فیصلے صادر کر رہے تھے۔

یٰسین نوری

"آپ حضرات محسوس کر رہے ہیں کہ پچھلے اٹھارہ سال میں مسلمانانِ ہند آہستہ آہستہ پسماندگی کا شکار ہوتے چلے گئے اور آج میدان میں دوسری برادرانِ وطن سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ قومی اور ملکی نقطۂ نظر سے یہ صورتِ حال بہت تکلیف دہ بلکہ خطرناک ہے۔ ہم آپ سب جانتے ہیں بلکہ اِن کوششوں میں شریک ہیں جو ہر جنبوں کو اونچا اُٹھانے کے لئے ملک بھر میں کی جا رہی ہیں۔ اِس ایک پسماندہ اور پست گروہ کی جگہ اگر خدانخواستہ کوئی دوسرا گروہ لے لے تو یہ بہت بڑا حادثہ ہوگا اور بہت بڑی نادانی بھی۔ دُنیا جانتی ہے کہ کسی ملک کا سب سے بڑا اثاثہ اس کے افراد ہوتے ہیں، پھر یہ کونسی خدمت ہوگی کہ چھ کروڑ افراد کو اثاثہ کی بجائے مستقل بوجھ بنا دیا جائے"

"علی گڑھ کی تحریک مسلمانوں کی پسماندگی کو دُور کرنے اور انھیں عام ملکی سطح پر لا کھڑا کرنے کا دوسرا نام تھی اور یہی ضرورت اور تقاضے آج بھی موجود ہیں۔۔۔ یہ علی گڑھ جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے اور جس کی ضرورت میں محسوس کر رہا ہوں، ملکی ماحول اور ملکی ڈھانچہ سے ہٹا کر کوئی نرالی چیز نہیں ہے بلکہ وہی حقیقت ہے جس کی اہمیت کو دستورِ ہند نے اپنی دفعہ ۳۰ کے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

- تمام اقلیتیں خواہ وہ مذہبی ہوں یا لسانی انھیں اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

کسی تعلیمی ادارے کو مدد دیتے وقت ریاست اس بُنیاد پر امتیاز نہ برتے گی کہ اس کا انتظام کسی لسانی، یا مذہبی اقلیت کے ہاتھ میں ہے۔

ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کی یو۔پی ریاستی مجلس عاملہ

۱۶ر اگست ۔ ۱۹۶۵ء

مرکزی وزیر تعلیم نے علی گڑھ یونی ورسٹی کی تاریخ میں فرقہ پرست عناصر کی بجا طور پر مذمت کی۔ مگر یونیورسٹی کی صحت مند روایات اور اس کے کارناموں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

کمیٹی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ یونیورسٹی کے جمہوری ڈھانچے یعنی منتخبہ کورٹ اور ایگزیکیٹو کونسل کو ممکنہ حد تک جلد سے جلد بحال کیا جائے، اور مسلم یونیورسٹی کے خصوصی کردار کو ختم کرنے کا نامناسب مطالبہ مسترد کر دیا جائے۔

کمیٹی کی رائے میں تعلیمی اداروں میں ذات پات اور فرقہ پرستی کے اثرات کو بالکل ختم کرنے کی کوشش اس وقت کامیاب ہو سکتی ہے، جب کہ یہ عام نوعیت کی ہو اور سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہو ــــ اور محض اقلیتی فرقہ کے خلاف نہ ہو۔

وائس چانسلر بنام چھاگلہ جی

...... مجھے یقین ہے کہ یونیورسٹی مسلم فرقے اور جمیع ہندستان کے لئے باعثِ فخر ہو سکتی ہے۔

یونیورسٹی کا عمل اور اس کی پالیسی پارلیمنٹ کے اس قانون کے تابع ہیں جس کے ذریعہ اس کا آئین دستورِ ہند کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ان مقاصد کے بھی تابع ہیں جن کے حصول کے لئے یونیورسٹی قائم کی گئی تھی، اور اب بھی قائم ہے۔ ان دونوں کے نتیجہ کے طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (الف)

ایک یونیورسٹی یعنی اعلیٰ تعلیم کا ادارہ...... (ب) ایک ایسی آل انڈیا یونیورسٹی ...... اور (ج) اس کے ساتھ ساتھ ایک مسلم یونیورسٹی ہونے کا لحاظ رکھے گی۔

ان مقاصد کی ۱۹۶۰ء کی انکوائری کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں جا بجا تشریح کی ہے اور اس رپورٹ کو حکومت اور یونیورسٹی دونوں نے قبول کر لیا ہے بالخصوص انکوائری کمیٹی نے یہ بتایا ہے کہ ۱۹۵۱ء کے ترمیمی قانون نے اصلی قانون کی دفعات کو دستور ہند سے مطابق کرتے ہوئے اس بنیادی امر اساس کو نہیں بدلا کہ یہ یونیورسٹی بحیثیت ایک مسلم یونیورسٹی کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے قائم کی گئی ہے۔ ...... خانگی اور سرکاری امداد کا اس طرح ساتھ ہونا ایک طرف تو یونیورسٹی کی مسلم اور دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ اس کی قومی حیثیت کو واضح کرتا ہے۔ ان دونوں میں سے اگر کوئی ایک حیثیت باقی رکھی جائے تو یونیورسٹی اپنی خصوصی پوزیشن کھودے گی، جو اس وقت اسے حاصل ہے۔ مزید برآں ان دونوں میں سے اگر کوئی ایک حیثیت کو باقی رکھنے کے یہی معنی ہوں گے کہ یا تو وہ مقصد فوت ہوگیا جس کا منشا مسلمانوں کی تعلیم کو فروغ دینا تھا یا بصورت دیگر پارلیمنٹ کے قانون اور اس کے ذریعہ سے قومی مفاد اور احاطۂ اقتدار کو بھلا دیا گیا، میں ان دونوں حیثیتوں کے اجتماع میں کوئی تضاد نہیں پاتا، اس لئے کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی ہندوستان کے قومی مفاد کے لئے ضروری ہے اور مسلمانوں کا مفاد ہندوستان کے قومی مفاد سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

اس موضوع پر آپ سے جو باتیں ہوئی ہیں، وہ مجھے یاد ہیں۔ ان کے

سلسلہ میں آپ نے فرمایا تھا کہ پارلیمنٹ کے اقتدار کے تابع حکومت کا ڈور کا بھی یہ منشا نہیں ہے کہ یونیورسٹی کے مسلم کردار کو بدلا جائے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ آپ کا ہمیشہ یہ مقصد ہوگا، اور آپ کو یہ توقع رہے گی کہ یونیورسٹی اعلیٰ تعلیمی معیار کو حاصل کرنے اور جدید ہندستان کے ڈھانچے میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کو آگے بڑھانے کی طرف تمام تر متوجہ ہوکر اپنے مقاصد کی افادیت کا ثبوت دیگی۔ بعد ازاں آپ نے اس بے بنیاد الزام کی بھی تردید کی کہ —— یونی ورسٹی پاکستانی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی ہے۔ ..... (۱۶ر جون)

چھاگلہ جی بنام وائس چانسلر

..... مجھے یقین ہے ..... کہ آپ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو ہمارے ملک کی ایک مثالی یونی ورسٹی بنانے میں کامیاب ہوں گے جو صحیح معنوں میں قومی ہوگی۔ یعنی ایک ایسا علمی ادارہ جو اسلامی کلچر اور اسلامی فلسفہ کے مطالعہ کو بڑی اہمیت دے گا۔ کیونکہ اس تہذیب اور فلسفہ نے ہماری مشترکہ تہذیب کی تشکیل میں اتنا بڑا حصہ لیا ہے اور آئندہ بھی لیتا رہے گا۔ اس ثقافتی ورثہ پر ہم کو جائز طور پر فخر ہے ..... آپ نے اپنے خط کے فقرہ ۱۶ میں جو کچھ لکھا ہے میں اس سے متفق ہوں یعنی علی گڑھ یونی ورسٹی کا مقصد یہ ہے کہ وہ " (الف) ایک ایسی یونیورسٹی یا اعلیٰ تعلیم کا ادارہ ہو جو اعلیٰ معیاروں کو برقرار رکھے اور ترقی دے۔ (ب) ایک ایسی آل انڈیا یونیورسٹی ہو جس کے دروازے سارے ہندستان کے لئے کھلے ہوں، اور سارے ہندستان سے اعلیٰ قابلیتوں کو اپنی طرف کھینچے اور (ج) اس کے ساتھ

ہندستانی تہذیب کی رنگارنگی میں ہندو تہذیب کو جو درجہ حاصل ہے ایک دوسری سطح پر وہی درجہ اسلامی تہذیب کو بھی ہے اور اس وقت تک کسی اچھی ہندستانیت کے ابھرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی جب تک ہندستانی اپنے تہذیبی ورثہ کی دونوں شاخوں سے واقف نہ ہوں۔ اول الذکر کے لئے بنارس کو خصوصی مقام دیا جا تا رہا ہے اور ثانی الذکر کے لیے کوئی اولیٰ درجے کی درسگاہ ہونی ضروری ہے تو ایک موجود درسگاہ کو، جو یہی مقصد حل کرتی رہی ہے نابود کرنا کونسی دانشمندی ہوگی۔

بدرالدین طیّب جی

اس عظیم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننے کے لیے مجھ سے ان لوگوں نے کہا جن کے لیے میرے دل میں بے پناہ عزت اور عقیدت ہی نہیں بلکہ ایک خاص لگاؤ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ معلوم کر کے میری انا کو تسکین ہوئی کہ ان لوگوں کے خیال میں علی گڑھ جیسی جگہ کے لیے میں نہایت موزوں شخص ہوں۔ لیکن پھر بھی مجھے اپنے پسندیدہ پیشے یعنی امور خارجہ کو چھوڑتے ہوئے کافی پس و پیش تھا۔ کیونکہ میری خیال میں اس کام کے لیے بھی میری کوئی غیر موزوں شخصیت نہ تھی۔ لیکن دوسری

جانب ان لوگوں کا یہ چیلنج میرے لیے ایک محرک ثابت ہوا جن کے خیال میں میرا علیگڑھ آنا ایک مصیبت کے مترادف تھا اور جو سمجھتے تھے کہ میں ایک دام فریب کے مثل تھا جسے یونیورسٹی میں بھیجنے کا مقصد شاطرانہ حکمت عملی سے یونیورسٹی کو دفتر شاہی کے حلقے میں گرفتار کرنا تھا۔ لیکن ان سب سے زیادہ میرے لیے چیلنج یہ تھا کہ علی گڑھ کو اس کی دیرینہ عظمت واپس دیتی ہے تاکہ نئے ہندستان کی قومی نشوونما کے لیے اسے ایک ایسے سرچشمہ کی حیثیت حاصل ہو جس کے حیات بخش دھارے سے ہندستانی سیکولر جمہوریت کی ہموار فصل کو تقویت اور توانائی حاصل ہو۔

اس چیلنج اور خود پسندی کی مشترکہ طاقت کو روکنا میرے بس میں نہ تھا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے اور دو سال کے لیے ڈیپوٹیشن پر علی گڑھ آنا قبول کرلیا۔ اگرچہ وائس چانسلر کے تقرر کی میعاد چھ سال ہوتی ہے، اور یونیورسٹی نے بھی میرا تقرر پوری مدت کے لیے کیا ہے۔ دس دن ہوئے دو سال کی یہ مدت ختم ہوگئی۔ مگر میں کچھ اور مہینوں کے لیے یہاں موجود ہوں تاکہ میری جانشین کے سلسلے میں مناسب انتظامات کئے جاسکیں!

علی گڑھ نے میرے سامنے جو چیلنج رکھا اس کے جواب میں میں نے کیا کچھ کیا؟ جن نقادوں کے خیال میں میری حیثیت حکومت کے آوردہ کی سی تھی، وہ بالآخر دوستی کی طرف مائل ہوئے اور اپنے تیروں کو کمان سے اتارتے رہے۔ انھوں نے مجھے آزاد پرواز کا موقع دیا جس کے لیے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ میرے لیے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں۔ کیونکہ نہ معلوم یہ لوگ

آئندہ کیا کچھ کر گزریں ۔ مجھے ابھی کچھ دن اور یہاں رہنا ہے۔

علی گڑھ کے اس چیلنج کا سب سے اہم پہلو جیسا کہ میں نے محسوس کیا یہ تھا کہ یہ حقیقت تسلیم کرالی جائے کہ یہ ادارہ ہماری قومی زندگی میں ایک اہم عنصر ہے۔ مزید یہ کہ اس کا انتظام اس طرح چلایا جائے جس کے ذریعہ نہ صرف قومی مقاصد کی تکمیل ہو، بلکہ اس کے ساتھ یہ محسوس بھی کیا جائے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے یہ واقعی گامزن ہے۔

علی گڑھ کو تین محاذوں پر تنقید اور دباؤ کا سامنا ہے۔ اوّل اِن لوگوں کی طرف سے جو کسی قیمت پر بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ تقسیم وطن کے بعد مرکزی حکومت ایک ایسے ادارے کی اعانت کرے اور فراخ دلی سے امداد دے جس کے ساتھ اسلامی روایات اور اس یونیورسٹی کے کردار کی خصوصیات وابستہ ہوں ـــ دوسرے ان لوگوں کی جانب سے جن کا یقین ہو کہ کسی نہ کسی صورت میں ہندستان کے سیکولر کردار کو ایسے اداروں کے وجود سے ضرر پہنچتا ہے جو کہ تاریخی ناموں اور خصوصیات کے حامل ہیں۔ یہ سب لوگ یکسانیت کے طلب گار ہیں، اور آخر میں وہ لوگ ہیں جو ماضی کے اس دَور میں واپس چلے جانے کے خواہشمند ہیں جب کہ یہ یونیورسٹی قریب قریب کلیتہً مسلمانوں کے روپے، صرف مسلمانوں کی کوششوں سے قائم تھی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُس دَور میں بھی اس یونیورسٹی کے دروازے دوسروں کے لیے قطعی طور سے کبھی بند نہ ہوئے تھے۔ مگر اس ادارے کی پالیسیاں اور طریقہائے کار دونوں بیشتر مسلم مفاد کی ترقی کے لیے وقتاً فوقتاً وضع ہوتے تھے۔

میرے خیال میں وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو پہلے محاذ سے ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے خیال میں تقسیم وطن کے بعد وہ چیز گویا ایک لعنت ہے جس میں اسلام کی جھلک نظر آتی ہے، جو ہماری ہندستانی تہذیب میں اسلام کی شرکت کے اجیار کی کوشش کرتی ہے، تمام وہ چیزیں جو ہمیں اس عظیم اخلاقی اور ثقافتی سرچشمہ سے وابستہ کرتی ہیں جو رسول عربی کی بعثت کے بعد ساری دنیا کو سیراب کر گیا اور جو آج بھی ہمارے شمال اور مغرب کے تمام پڑوسی ملکوں میں اثر انداز ہے، جو ہندستان کے پانچ کروڑ نفوس کی زندگیوں پر چھایا ہوا ہے، جو تیسرے نمبر پر دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی ہے۔ یہ لوگ سراسر غلطی پر ہیں، اور ہندستان کی سالمیت اور بہبودی کے لئے ان لوگوں سے کسی طرح کم خطرناک نہیں جنھوں نے ماضی میں اسلام کا نام لے کر دو قوموں کا نظریہ کا پرچار کیا، اور ہمارے قدیم ورثہ کو خونی ہنگاموں اور مصائب کی چھاؤں میں تقسیم کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ ایسے ہولناک حادثے اس برصغیر میں کبھی دیکھے نہ سنے اور خدا نے چاہا تو وہ پھر کبھی ظہور میں نہ آئیں گے۔

اس قسم کے لوگوں سے نباہ بڑا مشکل ہے۔ یہ سیاسی طور پر تنگ نظر ہیں اور تاریخی طور پر نابینا۔ ایسے اشخاص کے ساتھ نپٹنے کے لیے ثابت قدمی، مگر منصف مزاجی کی ضرورت ہے، اس کے لیے ایک شخص کو اپنے عقیدے پر کہ صداقت بالآخر کامیاب ہوتی ہے، مکمل بھروسہ ہونا چاہیئے۔ شرط یہ ہے کہ یقین کرنے والا خود بھی سچائی پر ہو۔

یہ کام آسان نہیں۔ کیونکہ اس کے برخلاف عمل کرنے کی ترغیب کچھ زیادہ

ہی ہوتی ہے۔ لیکن ان حالات میں ہار مان لینا تباہی کی طرف لے جائے گا، اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ جو جیسا کریگا وہ ویسا پائیگا۔ اس یونیورسٹی کو اور اس کے نصب العین کو زبردست نقصان پہنچارہے ہیں، ان لوگوں سے کہیں زیادہ نقصان جو اس یونیورسٹی پر اس محاذ سے کھُلّم کھُلاّ اعتراضات کرتے ہیں۔ بیرونی اعتراضات کا توڑ ممکن ہے لیکن ان جراثیم کا انسداد ناممکن ہے جو اندرونی طور پر اس کی زندگی کو گھُن لگا دیتے ہیں۔

دوسرے محاذ پر وہ اشخاص ہیں جنھیں میں امتزاجی سیکولرسٹ کہہ سکا ہوں۔ یہ تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان میں جو نیت کے صاف ہیں، اگرچہ وہ ہندستان میں مختلف قوموں اور نسلوں کے رنگ برنگے تانے بانے مذاہب اور تہذیبوں کے امتزاج سے بے خبر ہیں جس نے ہماری ہندستانی تہذیب کو بے مثال کر دیا ہے اور جس نے اس تہذیب میں بین الاقوامی مقبولیت کی خاصیت پیدا کی ہے۔ لیکن شاید یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم آسانی کے ساتھ اپنا ہم خیال بنا سکتے ہیں یا کم از کم ہم ان کو اس بات پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے نقطۂ نظر کو سمجھ سکیں۔

لیکن اس قسم کے لوگوں میں ایک بڑی تعداد ایسے اشخاص کی سرایت کر گئی ہے جن کا تعلق پہلے گروہ سے ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کا سیکیولرزم محض اس پر مشتمل ہے کہ ان تمام لوگوں کی انفرادیت ختم کردی جائے جن کا تہذیبی پس منظر ان کے اپنے پس منظر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ان لوگوں کا سیکولرزم گویا ایک پیکینٹ دوا ہے جو دیسی اور بدیسی اجزاء سے مرکب ہے اور جسے انھوں نے اپنے لیے خود ہی تجویز

کر لیا ہے۔ ایسے لوگ خطرناک ہیں۔ وہ فریبی ہیں اور ان کا خلوص مشتبہ ہے ان لوگوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک لازم ہے جیسا کہ پہلی قسم کے اشخاص کے ساتھ میں نے تجویز کیا ہے۔

لیکن حقیقی سیکولرسٹ کے ساتھ بحث مباحثہ ممکن ہے چاہے اس کا دل اور جذبات ہندستانی عکس نما یا کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتے لیکن اس کا دماغ اکثر و بیشتر اثر قبول کرتا ہے۔ اس کو ہماری ہندستانی تہذیب کی رنگا رنگی اور تنوع کے گوناگوں فوائد دکھائے جا سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ہم اس کو یقین دلا دیں کہ ایکتا کی کوششوں میں ہم اس سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔

اس آخری بات پر کسی طرح جھکنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کشمیر سے لے کر کماری تک ہندستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندستان کا اتحاد نہایت ضروری ہے۔ جس قدر ہندستانی یونین کے مختلف علاقے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رہیں گے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کا اہم قومی رول ہونا چاہیے کہ اس قسم کے اتحاد کو فروغ دے۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور مختلف صوبوں سے آنے والوں کے درمیان اتحاد پیدا کرے۔

آخری گروہ تیسرے محاذ پر ان لوگوں کا ہے جو اپنے عقیدوں پر کٹر اور خیالوں میں دقیانوسی ہیں۔ جن کے لیے زمانہ صدیوں سے ساکن ہی رہا ہے۔ جن کی یادوں میں صرف وہی باتیں محفوظ رہتی ہیں جو ان کی قوت تخیل انھیں سمجھاتی ہے۔ ان لوگوں نے تو سر سید احمد خاں کی شخصیت کو بھی اپنا جامہ پہنا دیا۔ اس شخصیت کو جو اپنے عہد

کے قدامت پرستوں کے لیے ایک مستقل خطرہ تھی۔

ایسے حضرات جن میں سے اکثر شدت سے خواہشمند ہیں کہ اس یونیورسٹی کو برقرار رکھا جائے چاہے وہ ایک میوزیم یا عجائب گھر کی حیثیت سے ہی کیوں نہ ہو، یہ اس ادارے کی بہبودی کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں، حالانکہ بعض لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہوگی۔ بظاہر ان کی اپنی حرکات مجموعی طور پر بے ضرر سی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنی منفی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں، اس طرح ان کا اثر صرف ایک مخصوص مختصر سے حلقے تک محدود رہتا ہے لیکن جو کچھ وہ کرتے ہیں یا اور لوگوں کو جو کچھ کرنے پر اکساتے ہیں، اتنا خطرناک نہیں جتنے خطرناک وہ مواقع ہیں جو وہ اپنے شدید مخالفوں کو بہم پہنچاتے ہیں جو ان کی وجہ سے اپنے عمل کو حق بجانب ثابت کرتے ہیں۔ ان کے مخالف پہلے مخاذ کے اشخاص ہیں جو جوابی کارروائیاں کرتے ہیں اور ہندستانی مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کی آڑ لیتے ہیں۔

حقیقت میں یہ لوگ کوئی خاص نمائندگی نہیں کرتے۔ کبھی کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے پبلک اعلانات خود اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے، مگر ایسے لوگوں کے دعوے بہت بلند بانگ ہوتے ہیں اور وہ لوگ جو اس یونیورسٹی کے مقاصد کے خلاف ہیں اپنے مفاد کے لیے ان بلند بانگ دعووں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ علی گڑھ والوں کے اسلامی عقائد کو کٹر اور تعصب پر مبنی بتایا جائے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

ایسے اشخاص کی ذہنیت پر افسوس ہوتا ہے۔ یہ عہد ماضی کے آثار قدیمہ ہیں ان حضرات کی حرکتوں کو برداشت کرنے کے لیے اپنے دل کو پتھر کا بنا لینا چاہیے۔

میں نے یوم سرسید پر تقریر میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ ہمیں "علی گڑھ کی ساری برادری کے تعاون کی ضرورت ہے کیونکہ علی گڑھ کے غیر مسلم شیدائی بعض معاملات میں ہمارے لیے مسلمانوں سے زیادہ مفید ہو سکتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ جو غیر مسلم یہاں ہیں انھیں اپنی سب سے عزیز دولت سمجھیں" اس توقع کو صریحاً صدمہ پہنچا ہے۔

اس دفعہ کیا ہوا۔ چند بدنیت باہر کے افراد نے جو تلقین وہ کرتے ہیں جس پر خود کبھی عمل نہیں کرتے، ایسے جوڑ توڑ کیے کہ ہمارا طرز عمل اپنی خواہش اور مفاد کے خلاف ہو گیا۔ ہم ان کی چالوں کا شکار ہو گئے۔ میں اپنے طلبا و ٹیچرس سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ اس چال کو سمجھ لیں گے اور انصاف، رواداری اور اخوت کے ان اصولوں کو برقرار رکھیں گے جو کسی بیرونی ایجنسی کے نہیں بلکہ ہمارے اپنے معیاروں کے مطابق ہوں گے۔

نوجوانوں کی اس نسل کو چاہیے کہ وہ اپنے بڑوں کو طور طریقے سکھائے اور یہ توقع نہ کرے کہ بڑے اس کے لیے ایک نمونہ اور مثال بنیں گے۔ بڑے یہ کیسے کر سکتے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے ملک اور بے شمار زندگیوں کو اس نوبت تک پہنچا دیا ہے۔ ان لوگوں سے تمھیں جو ورثہ ملا ہے وہ ذات پات کے فرق، گروہ بندی اور فرقہ واریت کا ہے۔ تمھیں ان بڑوں کو دکھانا ہے کہ تم نے اس ورثہ کا کھوکھلا پن

اور اس کی بلائیں دیکھ لی ہیں اور تم کسی حال میں اپنے کو ان کا شکار نہ ہونے دو گے۔ سنو کہ ہندستان میں فرقہ واریت [illegible] کے امام محمد علی جناح نے اپنی مراد پوری ہونے کے بعد جب یہ سمجھ لیا کہ ان کا دو قومی نظریہ پاکستان کو کس طرح تہس نہس کر دے گا تو ۱۵ اگست ۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کیا کہا تھا! انھوں نے اعلان کیا تھا:۔

"تم میں سے ہر ایک فرد خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو، خواہ اس کا رنگ، ذات یا مذہب کچھ ہی ہو، اول، دوم اور آخر اس ریاست کا شہری ہے، جس کے مساوی حقوق، مساوی اختیارات اور مساوی ذمہ داریاں ہیں، تم کسی بھی مذہب ملک یا فرقے سے تعلق رکھتے ہو، اس کا کوئی تعلق ریاست کے کاروبار سے نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول سے آغاز کرتے ہیں کہ سب ریاست کے برابر شہری ہیں۔ ہمیں یہ بات ایک نصب العین کے طور پر ہمیشہ ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہندو، ہندو نہ رہیں گے، مسلمان، مسلمان نہ رہیں گے۔ مذہبی معنی میں نہیں کیونکہ ہر فرد کے ذاتی عقیدے کا معاملہ ہے، بلکہ قوم کے شہریوں کی حیثیت سے سیاسی معنی میں۔"

افسوس ہے کہ اتحاد کا یہ خواب مسٹر جناح نے بہت دیر میں دیکھا۔ کچھ دن بعد ہی جب ان کا انتقال ہوا، تو ان کی آنکھوں سے بہت سے پردے اٹھ چکے

تھے، مگر ہم آج بھی ان کے تجربے اور ان کی اپنی پالیسی پر تکلیف دہ نظر ثانی سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ جب وہ تخریب کے حامی تھے تو انھوں نے دو قومی نظریے کی تبلیغ کی۔ جب وہ تعمیر کرنا چاہتے تھے تو انھوں نے اتحاد، مساوات اور ایک مشترکہ نصب العین کا نام لیا۔

ہم علی گڑھ میں تعمیر چاہتے ہیں۔ ہم ہندستان میں تعمیر چاہتے ہیں۔ پیام واضح ہے۔ اسے سنو اور اس پر عمل کرو۔

ہندستان میں مسلمان اب پوری آبادی کا دسواں حصہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اسی حالت میں ترقی کر سکتے ہیں، جب وہ دوسرے فرقوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہوں اور جب فرقوں کو یہ احساس ہو کہ مسلمانوں کا بھی ملک کی قومی زندگی میں اس کی فلاح و بہبود میں اس کی حفاظت میں قابل قدر حصہ ہے۔

لیکن ہم یہ اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہم نہ صرف اپنی مخصوص روایات کے مطابق اپنے کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے خاص کوشش کریں بلکہ جن فرقوں کے ساتھ ہم زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی روایات مخصوص تہذیبی میلانات سے بھی اچھی خاصی شناسائی پیدا کر لیں۔ کیونکہ اس طرح ہم ان کے ساتھ معاملات میں ناواقفیت اور تعصب کی بجائے آگہی اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ سب کچھ خلوص سے کریں اور اس میں کامیاب ہوں تو ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ دوسرے فرقے بھی ہمارے نقش قدم پر چلیں گے اور اسلام کے ہندستان پر جو تہذیبی اور تمدنی اثرات ہیں اور ان کی وجہ سے وہ مجموعی طور پر ہندستانی تمدن کی تعمیر اور اس کی آرائش و زیبائش میں اسلام کا جو کارنامہ ہے، اس کو سمجھنے اور اس کی قدر

کرنے کی وہ ضرور کوشش کریں گے۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہر ہندستانی کے دل میں اس کی قدر ضرور خوابیدہ ہے۔ ایسا کون ہندستانی ہے جس پر تاج محل کے حُسن کا جادو نہیں چلتا یا لال قلعے کی عظمت اور دہلی کی جامع مسجد کا جلال اُسے متاثر نہیں کرتا۔ کون ہو جو اگر غالب کو سمجھتا ہے تو اس کے طلسم میں اسیر نہیں ہوتا۔ ایسا ہندستانی کہاں ہے، اگر وہ نپٹ بہرا نہیں، جو میاں کی ٹوڈی کے آہنگ پر جھومتا نہیں۔ جب بڑے غلام علی اسے گا رہے ہیں یا اکبر علی خاں یا روی شنکر اسے بجا رہے ہوں۔ اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ تر کاری کھانے والا ایسا کون ہے جو سیخ کباب اور روغن جوش کو پسند نہ کرتا ہو!

اس ملک کے طول و عرض میں یہ قدر شناسی یقیناً موجود ہے۔ جو چیز اطمینان بخش حد تک موجود نہیں وہ یہ احساس ہے کہ ایسی قدر شناسی کے پیچھے مثبت عمل ہونا چاہیے، تاکہ ان میلانات کے سرچشموں کی نگہداشت ہو سکے جن سے تہذیب کے یہ پھول کھلے ہیں، اور ان کی چمن بندی ہو، تاکہ ان میں پھر کلیاں چٹک سکیں۔

ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں میں بھی اس ماحول سے شناسائی کی کمی رہی ہے ہے جس میں وہ تہذیب جس پر ہمیں اس قدر فخر ہے پروان چڑھی اور جس میں شائستگی کی اُن قوتوں اور اثرات کا خاص حصّہ ہے جو ہندستان کی تاریخ اور اس کی صدیوں کی تہذیب کا جزو لاینفک ہیں۔

ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ ایسا کیوں ہوا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ انگریزوں کے زمانے میں ذات پات کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ نہ

صرف اپنے مخصوص روایتی دائرے میں بلکہ فوج اور دوسرے انتظامی امور میں بھی۔ تعلیم میں بھی ایک ہندوؤں کا خانہ اور ایک مسلمانوں کا خانہ تھا۔ ہماری تو تاریخ بھی اس طرح تقسیم کی گئی تھی۔ یہی ہمارے فن کا حشر ہوا تھا۔ مسلمان اسلامی زبانیں اور اپنی تاریخ سیکھتے تھے اور غیر مسلم اپنی زبانیں اور تاریخ۔ ایک دوسرے سے ناواقفیت عام تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کے متعلق جو تھوڑا بہت علم تھا وہ بیرونی ماخذ کی بنا پر جو عام طور پر دو بڑے فرقوں میں ایک دوسرے کے ساتھ شدید جانبداری یا تعصب برتتے تھے۔ یقیناً ان کی وجہ سے اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو دونوں میں ایک دوسرے سے اچھی واقفیت اور مفاہمت نہ بڑھ سکی۔

پھر تقسیم ہوئی۔ ہم پر جسمانی اور نفسیاتی اعتبار سے اس کے کیا اثرات پڑے ہیں، ان کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ لیکن یہ بات ہمیں برابر یاد رکھنا چاہیئے کہ نہ صرف ہم پر بلکہ غیر مسلموں پر اس کے جسمانی اور نفسیاتی اثرات کیا مرتب ہوئے۔ کوئی ہم سے یہ توقع نہیں کرتا کہ تاریخ کے اس فیصلہ کن موڑ پر ہم نے جو کیا یا نہیں کیا اس کے لیے ہم مستقل توبہ کا لباس پہنے رہیں۔ لیکن ہم سے جو توقع کی جاتی ہے اور جو ہماری بقا کے لیے قطعی ناگزیر ہے، وہ اس بات کے واضح احساس کی ہے کہ پورے ہندستان کے لوگوں پر کیا اثر ہوا ہے اور ہمیں بھی ایسے طریقوں اور وسائل کی جستجو کرنا ہے جن کے ذریعہ سے اس قوم کو جس کے ہم ایک اہم جزو لاینفک ہیں جو جو نقصانات پہنچے ہیں ان کی تلافی ہو سکے۔ ہم صرف کنارے پر بیٹھے اپنے زخم چاٹتے رہیں اور اپنے نقصانات کا ماتم کرتے رہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ نقصان ساری

قوم کا ہوا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم جو کچھ گنوا چکے ہیں اسے حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور جو بچ گیا ہے اس کی پوری حفاظت کریں، کیونکہ وہی متعصب طاقتیں جن کی وجہ سے تقسیم عمل میں آئی تھی اس سرمائے کے لئے خطرہ ہیں۔

تعلیمی دائرے میں اس کام کو انجام دینے کا خاص طریقہ یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں میں اس ماحول کی بصیرت کو فروغ دیا جائے جس میں تہذیب جس پر ہم سب بجا طور پر فخر کرتے ہیں اور جس میں شائستگی کی قوتوں اور طاقتوں کا بہت ہاتھ ہے جو ہندستان کی تاریخ اور اس کی صدیوں کی روایات کا جزو ہیں پروان چڑھی۔ یہ تہذیب اس برّاعظم سے باہر نہ پھل پھول سکتی تھی اور نہ وہ صورت اختیار کر سکتی تھی جو اس نے کی۔ اس کی ہندستانیت ہی اس کی مخصوص آن بان کا سبب ہے۔ یہی ہندستانیت اس کے نمایاں کردار اور دلکشی کا راز ہے۔

میں آپ کو توجہ دلاتا ہوں کہ ہمارے مقاصد میں نمایاں مقصد ہندستانی تمدن کے مطالعہ کا فروغ ہونا چاہیئے اور اس مطالعہ میں ان تینوں عناصر کو ملحوظ رکھنا چاہیئے جنھوں نے اس کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ یعنی سنسکرتی، اسلامی اور مغربی۔ اگر ان میں سے کسی عنصر کو بھی نظرانداز کیا گیا تو ہم ہندستانی تمدن نہیں کسی اور چیز کا مطالعہ کر رہے ہوں گے۔

اس معاملے میں ہمیں خاص طور سے کوشش کرنا ہے۔ کیونکہ تقسیم کے بعد سیاسی حالات کی کروٹ نے ایک رقیب یعنی پاکستان کو میدان میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ریاستہائے متحدہ کے حالیہ دوروں میں مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ کہ

ہندستان کی پرانی اور اسے خانوں میں تقسیم کرنے والی تاریخوں سے ہدایت لیتے ہوئے وہاں کے ممتاز اہلِ علم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جس دور کو ہندستان کی تاریخ کا درمیانی دور یعنی وہ دور کہتے ہیں جب دہلی میں مسلم حکمراں تھے اور برصغیر میں اس دور کا سارا تہذیبی اور سماجی کارنامہ بظاہر پاکستان کی ملکیت ہے۔ اگر پاکستان کی یہ راست منشا نہیں تو اس کی جانی بوجھی چشم پوشی کی وجہ سے یہ ہندستان کو ایک ایسے تنگ لباس میں جکڑنے کوشش ہے جس میں زیادہ تر اس کی قدیم تاریخ یا ہندوؤں کا دور ہی آتا ہے۔

ہمیں اس کے خلاف اپنی آواز بلند کرنا ہے۔ کیونکہ یہ نہ صرف ساڑھے چار کروڑ ہندستانی مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہوگا جو دنیا میں تیسری بڑی مسلم آبادی ہیں، بلکہ ساری ہندستانی قوم کے لیے مضر ہوگا۔ اگر دنیا میں نہیں تو ایشیا میں تو ضرور۔ ہندستان کی انوکھی پوزیشن اس حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان، نہ بودھ ہے نہ عیسائی، نہ سکھ نہ جینی، بلکہ وہ سب کچھ ہے۔ وہ مذہبوں اور نسلوں کا ایک بے نظیر مرکب ہے جس کے ذریعہ سے اس نے اپنے سب ہمسایہ ملکوں سے گہرے رابطے قائم کیے ہیں اور ان پر اثر ڈالا ہے۔ خواہ وہ ملک مسلم ہوں، یا بدھ یا ہندو یا عیسائی۔ کوئی بھی ہندستان کے برصغیر پر اسلام کے اثر اور اسلام پر ہندستان کے اثر کا مطالعہ نہیں کر سکتا جب تک وہ اس کے سرچشمہ سے اس اثر کو نہ دیکھے اور اس کے قریب قریب سارے سوتے اب بھی ہندستان میں ہیں۔ اس بات کو واضح کر دینا اور اس کے پاس جو بھی وسائل ہیں ان کے ذریعے سے ایسے مطالعوں کو فروغ دینا ہمارا فرض ہے۔

یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ تقسیم کی جراحتوں نے اِن لوگوں کے ذہنوں اور طرزِ فکر کو جن کے علم و فضل اور جن کی فراست کی قسم کھائی جاسکتی تھی، کس حد تک مسخ کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ہندستان کی دو بڑی ...... مرکزی یونیورسٹیوں یعنی بنارس ہندو یونی ورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ناموں کے مسئلے کو لے لیجئے۔ میرے نزدیک حکومت ہند کا ایسا مدبّرانہ اور فیاضانہ اقدام مشکل سے کوئی دوسرا ہوگا جیسا کہ تقسیم کے بعد اس کا یہ اعلان ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک قومی مقصد کو پورا کر رہی ہے اور جس مقصد کے لیے یہ قائم کی گئی تھی اسے پورا کرنے کے لیے اس کی فیاضی سے امداد — مجھے آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ مقصد سارے ہندستان میں پسماندہ، مسلم فرقے کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنا، اور غیر مسلموں کے اس میں داخلے کی پوری آزادی دے کر فرقوں کے ذہنی اور تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے میں مدد دینے کا تھا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں اکتوبر ۱۹۶۲ء میں وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ آنے سے قبل وزارتِ خارجہ میں وہ مستقل عہدہ دار تھا جس کے فرائض میں مغربی ایشیا اور افریقہ کے ملکوں سے ہندستان کے تعلقات کی نگہداشت تھی اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں مجھے مغربی ایشیا کے تقریباً سبھی ملکوں اور افریقہ کے کچھ ملکوں کا دَورہ کرنے کا موقع ملا۔ اِس دَورے کا سب سے گہرا نقش جو میرے ذہن میں رہ گیا یہ تھا کہ ہندستان کے لیے اِن ملکوں میں خیر سگالی کے جذبات کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر تھا کہ حکومتِ ہند نے اسلامی

تہذیب اور علوم کی حفاظت کے لیے بہت کچھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ہندستان کے دوسرے اسلامی اداروں کے ذریعے سے کیا ہے۔ اس موسم گرما میں جب میں نے دولتِ مشترکہ کے وائس چانسلروں کی کانفرنس میں لندن اور سینٹ اینڈریوز میں شرکت کی اور حال میں جب میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ گیا تو بھی یہ بات مجھے محسوس ہوئی کہ ہر جگہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہندستان میں وجود کو ہی اس بات کا زندہ ثبوت مانا جاتا ہے کہ ہندستان اپنے قول اور عمل دونوں میں ایک سیکولر ریاست ہے۔ میں خیال کر کے کانپ اُٹھتا ہوں کہ اگر ایسی یونیورسٹی نہ رہی تو اس عقیدے اور خیال کا کیا حشر ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری سفارتوں کو اس کی مناسب تاویل کرنے کے لیے بہت کچھ تگ و دو کرنا پڑے گی۔ لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ تھک جائیں اور ان کے سُننے والے اُکتا جائیں۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی انھیں حاصل ہوگا۔ وہ یقیناً یہ کسی طرح نہ مانیں گے کہ ہندستان کے سیکولر کردار کو اس وجہ سے خطرہ ہے کہ اس ملک میں ایک یونی ورسٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے ہے جس میں ۳۵ فیصدی طالب غیر مسلم ہیں۔ ہاں اس کا اثر بالکل اُلٹا پڑے گا بلکہ ہندستانی جمہوریت کے سیکولر کردار کی نیک نیتی پر شبہ کیا جانے لگے گا اگر وہ ایسے ادارے کی حفاظت اور امداد نہ کر سکی۔

میں نے خود اور میرے خیال میں ہندستان کے نئے وزیر تعلیم نے بھی اپنی ابتدائی سکول اور کالج کی تعلیم ایک یسوعی ادارے میں پائی جو ایک مشہور رومن کیتھولک بزرگ کے نام سے موسوم ہے۔ ہمارے وزیر اعظم ٹرینیٹی کالج کیمبرج میں تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم میں سے کسی میں اس کی وجہ سے کوئی بھی کمی رہی یا ہمیں

کبھی اس بات کا احساس ہوا کہ اپنے ناموں کے باوجود یہ ادارے فرقہ وارانہ کردار کے تھے یا ان کی وجہ سے ہم میں فرقہ وارانہ ذہنیت پیدا ہو گئی۔ پھر ہندستان کے دو مشہور اداروں کے تاریخی ناموں کو بدلنے کی یہ شدید خواہش کیوں ہے؟ جنھیں بڑے محبان وطن نے مخصوص مقاصد کے لیے قائم کیا تھا یعنی سر سید احمد خاں اور پنڈت مدن مالویہ نے۔ اِن دونوں تک یہ بات پہنچے کہ اس قسم کی ایک تحریک چل رہی ہے تو ان کی روحوں کو اس سے تکلیف ہو گی۔ کیا سیکولر ہندستان میں ہندو اور مسلم کی اصطلاحیں ایک تغیر کی حامل ہو گئی ہیں جو کچھ بدنام سی ہے یا جو بہت زیادہ متعدی مرض پھیلاتی ہے؟ میرے نزدیک ایک سیکولر ہندستان کے وجود کا رمز یہی ہے کہ اس ریاست میں ہندو اور مسلم کی اصطلاحیں ہندستانی شہری کے مترادف ہو جائیں گی۔

کسی ادارے کا کردار اس کا نام بدلنے سے نہیں بدلا جا سکتا۔ اگر اس کے کردار میں کوئی خامی ہے تو ہمیں مسئلے کی تہہ تک جانا چاہیے اور محض کوئی نیا غازہ یا نئی آرائش کر کے اپنی لاج رکھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یونیورسٹی کے سیکولرزم کی بنیاد اس کے ڈھانچے پر منحصر ہوتی ہے۔ یعنی وہاں کون علم حاصل کر رہا ہے اور کون کیا تعلیم دے رہا ہے۔ میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ ہندستانی سماج جیسا ہونا چاہیے جس میں تمام فرقوں کی نمائندگی ہو اور جس میں ہر ایک کے طرز زندگی کے لیے رواداری کا اظہار ہو، اس کی صحیح تصویر جیسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ملتی ہے ویسی شاید ہندستان کی کسی اور یونیورسٹی میں نہیں ہے۔ اگر ہم علی گڑھ کے کامل ہونے کا دعویٰ کریں تو یہ حماقت ہو گی، لیکن ہم اس کے لیے آمادہ ہیں کہ ان معاملات

میں اپنے کو بہتر بنانے کے لیے ہمیں ہر کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے اگر ہماری ان
یونیورسیٹیوں کو جو مرکز کے تحت ہیں حقیقی قومی اداروں کی طرح کام کرنا ہے جہاں
ہندستان کے مختلف فرقوں میں جذباتی اور تہذیبی ہم آہنگی کو خاص طور سے
فروغ ہونا چاہیے، اور مجھے اس رائے سے پورا اتفاق ہے تو دوسری یونیورسٹیوں
میں بھی جو مرکز کے تحت ہیں یہی پیرایہ مناسب حدود میں نافذ کرنا چاہیے۔
اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ داخلوں، رہن سہن کے مسائل، درسی نصاب
سب میں اس بات کی وضاحت ہو کہ ہر فرقے کے افراد ان اداروں میں تعلیم
پا سکیں، بلکہ ان کی مناسب تعداد میں داخلے کے لیے ہمت افزائی ہونی چاہیے
تاکہ ان میں سے ہر ایک ادارے میں اس ادارے کی اکثریت کے علاوہ دوسرے
فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو اس بات کا پورا موقع ملے کہ وہ اکثریت
کے فرقہ کی تہذیب اور ہندستانی تمدن میں اس کے کارنامے کا مطالعہ کر سکیں۔
اس طرح ہر فرقے میں ایسے افراد پیدا کرنے میں مدد ملے گی جو دوسرے فرقوں
کے افراد کے مشترک تہذیب میں کارنامے سے واقف ہوں گے۔ ہندستانی
قوم کی سالمیت اور حفاظت کے لیے اس سے زیادہ قابل قدر کوئی اور تعلیمی
اقدام نہیں ہو سکتا۔

میں ایک آخری اپیل اور کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں ان تمام ذرائع سے
کام لے کر جو ہمارے پاس ہیں ہندستانی مسلمانوں کی جماعت کو اس زمانے
کے چیلنج کے قبول کرنے کا اہل بنانا چاہیے جس میں ہم رہتے ہیں۔ انھیں اپنی

شاندار میراث کا پھر احساس دلانا چاہیے، اور ان ذمہ داریوں کا بھی جو اس وجہ سے ان پر عاید ہوتی ہیں۔ ان پر یہ حقیقت روشن کرانا ہمارا فرض ہے کہ وہ دنیا میں مسلمانوں کی تیسری بڑی جماعتیں ہیں اور اس برصغیر کے مسلمانوں کی پچھلی جماعت کا محض ایک حصہ یا اس کی اقلیت نہیں ہیں، بلکہ وہی جماعت ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے کے مقابلے میں یہ جماعت چھوٹی ہے، مگر اس کے پاس وہ ساری پونجی ہے جو اس جماعت کے پاس تھی۔ اس برصغیر کے خاص خاص اسلامی مرکز، اس کی مخصوص مسلم یونیورسٹی، اسلامی فکر و علوم کے بڑے کتب خانے، بڑے بزرگوں کے مزار یعنی وہ تمام چیزیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کی جماعت کو ماضی کے ہندستان میں اس کی شان اور اس کا بلند درجہ حاصل تھا اب بھی ہندستان میں ہیں اور ہندستانی مسلمانوں کی موجودہ جماعت کی دسترس میں ہیں۔ اب صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی تعلیمی پالیسی کی اس طرح تشکیل کریں کہ ہم اس سارے سرمائے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے قابل بن جائیں تاکہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے ہندستانی سماج میں ایک ایسی جگہ پھر حاصل کر سکیں جو اس جماعت کے ماضی کے شایان شان ہو اور جو ایک عظیم تر ہندستان کی تعمیر کے لیے راستہ ہموار کر سکے۔ یہ ہندستان پہلے سے عظیم اس لیے ہوگا کہ یہ زیادہ متحد ہوگا اور اپنے تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں کی قدر کرنے کا زیادہ اہل ہوگا، اور یہ مذہبی فرقوں اور نسلوں میں رقابت سے زیادہ آزاد ہوگا۔ اس مقصد کے لیے ہمیں سبھی ہندستانیوں کے تعاون، ان کی ہمدردی اور مفاہمت کی ضرورت ہے۔

علی گڑھ کا مسئلہ

علی گڑھ کا مسئلہ الگ مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو تقسیم شدہ ہندستان میں ایک قوم کے ممتاز تہذیبی گروپ کی حیثیت سے باقی رہنا ہے یا ختم ہونا ہے۔ اس بات کو اب صاف ہو جانا چاہیے۔ منافقت ڈپلومیسی یا گی لیٹی رکھنے میں پوری ہندستانی قوم کو بڑا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

دو صورتیں ہیں، اور دونوں طرح مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ایک یہ کہ ہندستانی مسلمان اپنا نام رام لال اور گوپال داس رکھنے لگیں۔ ہولی، دیوالی دسہرہ اور تہوار اسی طرح منائیں، جیسے برادرانِ وطن؛ دھوتی پہنیں (جیسے گاؤں میں اکثر مسلمان پہنتے ہیں)؛ شرعی داڑھی اور ترکی مونچھیں رکھنے کی بجائے عام طریقہ کا چہرہ رکھیں (جیسے اس وقت ۹۰ فیصدی مسلمان رکھتے ہیں)۔ اردو کے بجائے ہندی کو یکسر اپنالیں۔ اور نجی مذہبی فرائض ہیں، نماز گھروں میں جس کا جی چاہے پڑھ لے (ورنہ اب بھی ۱۰، ۲۰ فیصد سے زیادہ کہاں پڑھتے ہیں!) زکاۃ کا سلسلہ تو تقریباً ختم ہی ہے؛ قربانی کو اڑا دیں کہ برادرانِ وطن کو

تکلیف پہنچتی ہے کہ بلا وجہ جان دار کی جان جاتی ہے۔ رمضان کے روزے البتہ بے ضرر ہیں۔ محرم بھی چل سکتا ہے۔ حج کی البتہ گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ یہاں ایک غیر زمین سے وفاداری کا سوال آجاتا ہے اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے روابط کا مسئلہ چھڑ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہونے لگے تو پھر کچھ دن بعد مسئلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ میرے ایک بہت محترم بزرگ اور ہندستانی مسلمان مفکروں میں بڑا اہم مقام رکھنے والے ایک علیگیرین کا کہنا ہے کہ مسلمان اپنی طرف سے پہل کریں یا نہ کریں بیس پچیس سال میں (انھوں نے شاید دس پندرہ سال کہا تھا)، میں ہونا یہی ہے کہ مسئلہ خود بخود ان خطوط پر آکر ختم ہو جائے گا۔ ٹھیک ہے اگر مسئلہ کا حل یہی ہے تو اچھا ہے روز کا خون خرابہ، آئے دن کے فساد اور ہر چھوٹی سی چیز کو بہانہ بنا کے ایک طوفان کھڑا کر دینے سے تو اچھا ہے کہ یہی ہو جائے۔ اسلام نہ سہی ہندستان ہی زندہ رہے!

مگر عملاً یہ ممکن نہیں ہے اس لئے ممکن نہیں ہے کہ ہندوستان کے دونوں بازوں پر دس کروڑ مسلمانوں کی آزاد حکومت قائم ہے جن سے ہندستانی مسلمانوں کے زندہ روابط ہیں، اٹوٹ روابط، اس لئے ممکن نہیں ہے کہ مذہب سے لاپروائی کے باوجود ہندوستانی مسلمان اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ مذہبی مسلمان، مذہب پر عامل مسلمان سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ممکن نہیں ہے کہ پورا جنوبی ہندوستان اس ساری فرقہ پرستی کی زد سے باہر ہے، اور وہاں کے مسلمان اتنی ہمت رکھتے ہیں کہ علی الاعلان آزادی کے بعد بھی مسلم لیگ کو حاکمانہ انداز سے چلا رہے ہیں، اس لئے ممکن نہیں ہے کہ جمہوریت میں ہمیشہ طاقت کا توازن رکھنا پڑتا ہے، الیکشن جیتنے کے لئے ہر پارٹی کو بارگیننگ کا خیال رکھنا ضروری ہوتا

ہے۔ اور یہ تو کانگریس ہے جن سنگھ بھی حکومت سنبھال لے تو اُسے بھی چھ کروڑ کی غیر معمولی تعداد کا اتنا ہی خیال رکھنا پڑے گا (یہ محض کانگریس کی آئیڈیالوجی یا کسی شخصیت کا اثر نہیں تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں برابر مراعات ملتی رہیں اور آج بھی مل رہی ہیں!)

پھر دوسری صورت ہی باقی بچتی ہے کہ

با ہمیں مرد ماں بباید ساخت

ہندوؤں کے لئے بھی ______ مسلمانوں کے لئے بھی! اور اسی کی راہیں سوچنا چاہئیں۔ پہلی صورت انضمام کی تھی۔ دوسری صورت اتحاد اور ارتباط کی ہے۔ جس کے لئے ہمارے ملک میں جذباتی ہم آہنگی کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔

اس جذباتی ہم آہنگی، اتحاد، اور ارتباط کی جو راہیں بھی ہوں، ان میں سے ایک راہ یہ ضرور ہوگی کہ جو ملا جلا ہندو مسلم کلچر پچھلے ہزار سال میں ہندستان کے خمیر میں گندھ چکا ہے اس کو قدرتی طور سے پھولنے پھلنے کا موقع دیا جائے اور کسی بھی مصنوعی عمل سے اس کے راستے میں روڑے نہ اٹکائے جائیں۔ ہندو بھائیوں کی طرف سے اس ملے جلے کلچر کے جو بھی عناصر پیش کئے جائیں، ان پر غور کیا جانا چاہیئے۔ لیکن مسلمانوں کی طرف سے اُردو اور علی گڑھ دو اہم نشان ہیں۔ اُردو واضح ہے اور علی گڑھ مبہم۔ اس ابہام کی وضاحت یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کو سیکولر سوشلسٹ جمہوریت کے دستوری حدود کا احترام اور پابندی کرتے ہوئے اِن ساری تہذیبی آزادیوں کو استعمال کرنے کا حق دیا جاتا رہے جو ان کی پہچان ہیں اور جن کے استعمال سے وہ یہاں کے مسرور، مطمئن اور سرگرم اچھے اور سچے شہری بن سکیں۔ وہ زمانہ کی دوڑ میں، جو کسی کے لئے بھی نہیں رُکا تو تو ہندوستان کے لئے کیا رُکے گا، ملک کی مدد کر سکیں، تا آنکہ دوسرے

اداروں میں ان کیلئے علی گڑھ جیسا شفقت، محبت اور برابری کا برتاؤ ہونے لگے اور پھر وہ ساری یونیورسٹیوں کو اپنا سمجھ سکیں۔

دوسرے اداروں کو علی گڑھ کی سطح پر لانا، پہلا کام یہ ہے۔ نہ کہ علی گڑھ کو دوسرے اداروں کی سطح پر لانا۔ اور یہاں مسئلہ بنیادی یہی ہے کہ عوام کے دلوں کو کیسے بدلا جائے، اور خواص کی سرپرستانہ ذہنیت کو کیسے محبت اور شفقت میں تبدیل کیا جائے۔ کیسے ان کے دلوں کو جیتا جائے۔ ان کے شکوک و شبہات کو دور کیا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ مسلمان بھی انسان ہیں، اسی خدا کے بنائے ہوئے ہیں جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ وہ بھی اسی سرزمین سے اُپجے ہیں اور یہیں کی مٹی میں مل جائیں گے۔ یہاں کے پانی، ہوا، زمین اور دولت پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا۔ اس ملک کو خوب صورت اور سڈول بنانے اور تراش تراش کرنے میں ان کی صلاحیتیں بھی تمہارے برابر ہی استعمال ہوتی ہیں؛ ہوتی بھی ہیں

مگر یہ سب کچھ حکومت کو بھی کرنا ہے اور مسلمان کو بھی۔ افسوس یہ ہے کہ آج تک نہ حکومت نے اس کے لئے باقاعدہ مرتب اور منظم طریقہ پر کوئی پلاننگ کی، اور نہ خود مسلمانوں نے برادران وطن کو اپنے قریب لانے کی کوشش کی، دوسری طرف برادران وطن خود ایسے برگشتہ ہیں کہ انھوں نے از خود اس کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ اقلیت کے دلوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے، ان کا دکھ درد پوچھتے اور انہیں گلے لگاتے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہو، یہ بات لغو ہی نہیں خود اسلام کے بھی منافی ہے۔ اگر اس کے نام پر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اور واقعتہً بھی سرسیّد کے عہد سے آج تک کبھی ایسا نہوا کہ یہ محض مسلمانوں کی یونیورسٹی رہی ہو۔ اس دور میں بھی جب "پاکستانی" اس پر چھائے ہوئے تھے طلبا رہی نہیں اساتذہ میں

بھی ہندو کچھ سب شامل تھے اور پچھلے دس پندرہ سال سے تو یہ تعداد چالیس فی صدی کے لگ بھگ پہنچ چکی ہے کچھ اس لئے بھی کہ اب برادران وطن اس کی طرف سے مشکوک ہونے کم ہو گئے اور کچھ اس سبب سے کہ مسلمانوں کا مالدار طبقہ جو پیسے خرچ کر کے اعلیٰ تعلیم دلاتا تھا، بڑی تعداد میں پاکستان چلا گیا، یہ تعداد پچاس اور ساٹھ فیصدی بھی ہو سکتی ہے، لیکن ایسا ہوا تو ملک کے لئے اچھا نہیں ہوگا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طرف اشارہ ہوگا کہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دن دونی اور رات چوگنی بڑھ رہی ہے، اور دوسرے اسی پسماندگی کے نتیجہ میں پورا ہندستان عالمی ترقی کی دوڑ میں کئی سال پیچھے پہنچ جائے گا۔ یہ محض مفروضہ نہیں ہے کہ ۶ کروڑ شہریوں کو نظر انداز کر کے جمہوری ہندستان ترقی معکوس میں بہت سے نیم وحشی ممالک سے بھی آگے نکل جائے گا۔ اس ملک میں بسنے والے کسی بھی فرقہ کی تعلیمی، اقتصادی، پسماندگی اب اس فرقہ کا نقصان نہیں رہے گی۔ یہ بات صرف غلامی میں ممکن تھی۔ غلام ہندستان آزاد ہو چکا ہے اور جمہوریت بن چکا ہے اور اشتراکی سماج برپا کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کیلئے نہ یہ ممکن ہے نہ قابل عمل کہ ۶ کروڑ کی غیر معمولی بھاری تعداد کی طرف سے آنکھیں میچ کے منزل کی طرف بڑھتا چلا جائے۔

یہ بات کہ آخر صرف علی گڑھ ہی اس پسماندگی کا سارا علاج کیوں ہے، سمجھائی نہیں جا سکتی ہے محسوس کی جا سکتی ہے۔ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، کہ ہندوستان کی اسّی سے اوپر یونیورسٹیوں میں اور بیسیوں میڈیکل کالجوں اور ٹیکنیکل اداروں میں داخلے کے سلسلے میں ہندستان مسلمان طالب علم کو وہ سہولتیں نہیں مل پاتی ہیں جو اس کے ہندو بھائی کو مل جاتی ہیں۔

خود میں بھی علی گڑھ کو سارا علاج بنانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس وقت تک کہ دوسرے اداروں میں مسلمان ہندستانی کو علی گڑھ جیسے حقوق ملنے لگیں میں اس بات کو مناسب

بی نہیں ضروری اور ناگزیر سمجھتا ہوں کہ ملک کی ترقی کی خاطر علی گڑھ کو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کیلئے مخصوص رکھا جاتا ہے۔

علی گڈھ[1] کے حالیہ حادثہ، اس کے مابعد کے واقعات، اور پھر وزیر تعلیم چھاگلہ جی کی سفارش پر آرڈیننس کے پاس ہونے تک، خود علی گڑھ والے کیا سوچتے رہے؛ ان کا رد عمل کیا رہا، اسکے بارے میں سنی سنائی یا اخباروں کے کالموں میں چھپی چھپائی خبروں اور مراسلوں کے سوا کچھ پتا نہ چل سکا۔ تا آنکہ اس کا موقع ملا کہ دو ایک روز کے لئے میں خود علی گڑھ پہنچ گیا۔

علی گڈھ میں صورت حال یہ ہے کہ پی۔ اے سی کے کچھ جوان لائبریری کے عقبی لان میں اور کچھ فینش گیٹ کے پاس پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ باقی کام حسب معمول ہو رہے ہیں، اور توقع ہے کہ ہوتے رہیں گے۔ اساتذہ اور متعلقین ہنوز دو روایتی گروپوں میں بٹے ہوئے ہیں اور شدت سے ایک دوسرے کے خلاف محاذ بنانے کے درپے ہیں۔

نواب علی یاور جنگ ایک قدیمی علمی گھرانے کے فرد، عماد الملک بلگرامی کے نواسے، دنیا کے اہم ترین ایوانہائے حکومت میں ہندوستان کی نمائندگی کر چکنے والے اور زندگی کے بڑے حصے میں تعلیم اور تعلیم گاہوں سے وابستہ رہ چکنے والے۔ علی گڑھ کو کو مسلمانوں میں ان سے زیادہ معتبر، روشن دماغ اور بیدار مغز وائس چانسلر بحالات موجودہ اور کون مل سکتا تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یونیورسٹی میں آئے انھیں چند ہفتوں کی مدت بھی نہ گزری تھی کہ انھوں نے ایک ایسے مسئلہ کو چھیڑ دیا جو اختلاف

---

[1] یہ تحریر لکھے جانے کے وقت ۶۵ء کے حادثہ پر حالیہ کا اطلاق ہوتا تھا۔

رائے کا سبب بن سکتا تھا۔ ان کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط ۔ یہ بحث الگ ہے ۔ لیکن
اس فیصلے کے لئے مناسب وقت یہ تھا، اس پر دو رائیں مشکل ہی سے ہونگی ۔
اور غالباً نواب صاحب خود اس کے حق میں ہوں گے کہ انھوں نے عجلت سے کام لیا۔
اس کے نتیجہ میں جو کچھ ہوا وہ پوری علیگرین دُنیا کا سر شرم سے جھکا دینے کے
کافی ہے ۔ اِس کا کوئی سوال نہیں کہ طلبا کتنے قصور وار ہیں اور کتنے بے قصور، اساتذہ
میں کتنے اسلام پسند، اور کمیونزم پسند عناصر کی آپسی آویزش کو اس میں کتنا دخل رہا،
پولیس نے اور پولیس کو بلانے والوں نے حماقت کی یا دانشمندی کا ثبوت دیا ـــــ
اور وائس چانسلر علی یاور جنگ کا لڑکوں کے صحیح یا غلط مطالبے کے سلسلے میں الگ تھلگ
رہنے کا رویہ دُور اندیشی کا ثبوت ہے یا کم نظری کی دلیل، یہ سب بحثیں فضول ہیں،
جن کا نہ کوئی عملی فائدہ ہے نہ ان سے مستقبل سنبھل سکتا ہے۔ یہ طے ہے کہ جو کچھ ہوا بُرا
ہوا۔ اتنا بُرا ہوا کہ علی گڑھ والے جو علی گڑھ پر فخر کرتے تھے، اس کی شاندار
روایات پر۔ اس کے ڈسپلن پر، طلباء پر، اساتذہ پر، شیخ الجامعہ پر ـــ وہ سب پونجی
لُٹ گئی ۔ اس زمانہ میں ایک خط میں میں نے اس حادثہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک شعر
نقل کیا تھا:

عجیب چیز ہے احساسِ عظمتِ آدم
کوئی گناہ کرے اور مجھے حجاب آئے

واقعہ یہ ہے کہ آج بھی شرم سے سر نہیں اُٹھا سکتا، معلوم ہوتا ہے سب کچھ
میں نے کیا ہے ۔ وائس چانسلر کی جلد بازی بھی میری کردہ ہے لڑکوں کی بد تمیزی بھی گویا میں
نے ہی کی ہے ۔ کمیونسٹ استاد بھی میں خود ہی ہوں ۔ اسلام پسند بھی میں خود ہی ہوں
اور میں نے ہی علی گڑھ کو قعرِ مذلت میں پھینک دیا ہے ۔
جو کچھ ہوا برا ہوا، بہت بُرا ہوا۔ اس کے نتیجہ میں فرقہ پرست مجنونوں نے ۔

ہندوؤں اور مسلمانوں نے۔ اپنے اپنے حلقہائے اثر میں علی گڑھ کے خلاف، یا موافق شدید قسم کے زہرناک خیالات بکھیرنا شروع کر دیے۔ علی گڑھ کچھ بھی ہو، وہ یقیناً نہیں ہے جو اس کے دوست نما دشمن اس کے بارے میں بتا رہے ہیں، نہ وہ کچھ ہے جو اس کے نادان دوست نمائندگی کر رہے ہیں۔

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کم نظروں نے علی گڑھ کو بھی ایسی ہی عام یونیورسٹی سمجھ لیا جیسے ہندوستان کی کوئی بھی یونیورسٹی جسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تسلیم کر لیا ہو۔ اور بظاہر فرق بھی کیا ہے، عمارتیں ہیں، طلبا ہیں، اساتذہ ہیں، یو۔ جی۔ سی سالانہ گرانٹ دی جاتی ہے۔ ان سب کے مجموعہ کو ایک قانون داں یونیورسٹی کے سوا اور سمجھ بھی کیا سکتا ہے۔ کسی کاروباری کا لکھا ہوا خط، کسی نامہ نگار کی لکھی ہوئی رپورٹ، کسی دفتر کی رسمی خط و کتابت، اور کسی کی خون دل سے لکھی ہوئی چند سطریں، سب کی سب پر تحریر کے لفظ کا اطلاق ہوگا، اور قانون داں کی نظر میں ایک تحریر اور دوسری تحریر میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ تفصیل میں وہ پڑے گا نہیں، جواہر لال کون تھا، گاندھی کون تھا، اجمل خاں کس چڑیا کا نام تھا۔ انصاری کیا چیز تھا۔ سید احمد کی حیثیت کیا تھی، اس سے انصاف پسند، مساوات پسند، قانون داں کو کوئی غرض نہ ہوگی، اس کے نزدیک سب اس جیسے یا جیسے آدمی تھے۔ انھوں نے کل جو کچھ بھی کیا ہو آج کے مسلمان کے لئے تو وہ محض تاریخ ہیں اور بس۔ نہ ان کا کوئی قابل لحاظ کام ہے نہ نام۔ سید احمد اور اس کے ساتھیوں نے علی گڑھ کالج بنانے میں، اور اس کے بعد محمد علی اور ابوالکلام نے اسے یونیورسٹی بنانے میں جیسی شاندار جدوجہد کی، اپنوں کے دشنام اور غیروں کے طعنے سہے، مگر مقصد کو حاصل کر کے رہے! پھر اسی

یونیورسٹی نے ہندوستان کو کیا کچھ نہیں دیا؛ پاکستان کا مرحوم وزیراعظم اور موجودہ صدر بھی دیا ہندوستان کا مرحوم وزیر غذا (قدوائی)، اور موجودہ نائب صدر بھی عظیم قائد مولانا محمد علی شوکت علی بھی۔ اور درویش صفت حسرت موہانی بھی! یہ سب کچھ اس کی نظر میں اوراق پارینہ ہیں۔ آج اس کی صرف یہ حیثیت ہے کہ وہ یو۔جی۔سی کی پروردہ ایک یونیورسٹی ہے، اور بس!

"علی گڑھ ایک قدیم درسگاہ ہے۔ اِس کی روایات عجیب غریب ہیں اس کے عہد ماضی کی تاریخ عظیم الشان ہے۔ وہ بجا طور پر فخر کرسکتی ہے کہ اس نے ہندوستان کو علی برادران جیسی ہستیاں عطا کی ہیں۔ وہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا معروف مرکز ہے"

گاندھی جی نے کہا تھا

(ینگ انڈیا ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء)

ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا

"مسلمانانِ ہند آج بھی دنیا کی تیسری مسلم آبادی ہیں۔ ان کی ترقی ہندوستان کی ترقی، اِن کی بدحالی سارے ہندوستان کی بدحالی ہے۔ ان کے سپرد اپنے ملک کی خدمت کی ذمہ داری ہے، اور ملک پر ان کی فلاح و بہبود کی کوشش فرض ہے۔ آزادیِ ہند کے بعد سے علی گڑھ کی روئداد اسی حقیقت کی تعبیر رہی ہے۔ گزشتہ عہد میں جب علی گڑھ پر انگریزی حکومت کی خاص نظر التفات بتائی جاتی تھی، سالانہ ساڑھے تین لاکھ کی امداد ملتی تھی جو مسلمانانِ ہند کی روح اور ان کے ضمیر کی قیمت تھی، کیسی ارزانی تھی اس جنس کی! آزادیِ ہند کے بعد سے حکومتِ ہند کی سالانہ امداد کا اوسط ۲۰ لاکھ سے کم نہیں رہا ہے ...... اور پچھلے سات سال سے زیادہ کے زمانے میں جب وہاں ذمہ دار کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں ایک

واقعہ ایسا نہیں جب حکومت نے کسی معاملہ میں کسی قسم کی مداخلت کی ہو، یا ہدایت دی ہو، یا اعتراض کیا ہو؛ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی بدخواہ نے حکومت سے کچھ کرنے کی خواہش کی ہے تو اس کو صاف جواب دیا گیا کہ یونی ورسٹی ایک خود مختار ادارہ ہے حکومت اس کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتی۔

"........ یہ حال کسی غیروں کے ادارے کا نہیں ہو سکتا مسلمانان ہند، ہندی قوم کا ایک اہم جزو ہیں۔ ان پر قومی زندگی کے تمام فرائض عائد ہوتے ہیں اور قوم سے اپنی ترقی و بہبود کے وسائل لینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ آپ خوش ہونگے کہ یہ فرض بھی پورا ہو رہا ہے اور یہ حق بھی ادا کیا جا رہا ہے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانان ہند کا مقام ہندی قوم میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمان آبادیاں دنیا میں بہت ہیں۔ کہیں خدا کے فضل سے اپنی زندگی کی تشکیل میں خود مختار ہیں کہیں دوسروں کے زیر اقتدار آزادی سے محروم! مسلمانان ہند کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی کے زیر اقتدار نہیں، لیکن تنہا اقتدار بھی نہیں رکھتے۔ وہ ایک آزاد جمہوریہ میں آزاد شہری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کی آبادی مختلف مذاہب و مسالک، مختلف السنہ اور مختلف تاریخی و تمدنی عناصر پر مشتمل ہے۔ اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہوتی جا رہی ہے مسلمانوں کی وہی ہندوستانی زندگی میں ہے۔ جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے سے مختلف اعمال و اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ اپنی مثال اپنے افکار کی بلندی اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح، صحت مند زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اسی طرح مسلمانان ہند پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیات طیبہ اسلامیہ کا ایسا نمونہ

پیش کریں جس سے ان کے ہموطنوں کے دل میں ان کے دین کیلئے جگہ پیدا ہو، زندگی کی وہ اعلیٰ قدریں جن کے یہ حامل ہیں، عام ہندی زندگی کو متاثر کریں اور یہ کہ رحمت اللعالمین کے نام لیوا اپنے وطن اور اہل وطن کے لیے مثال اور رحمت کا کام دیں۔

...... یہ ایک بڑا فریضہ ہے، ایک عظیم الشان مشن۔ اور میں اس کا حق ادا کرنے کی دشواریوں سے ناواقف نہیں ہوں۔ یہ ہے مقصد ہے از آسماں بالاتر ہے، لیکن آسمان کے ستاروں کو دیکھ کر ہی سمندر کی تاریکیوں میں حوصلہ مند ملاحوں کے بیڑے پار لگتے ہیں۔ مسلمانان ہند کا شرف یہ ہے کہ ان کے افکار سے ہندی زندگی بہرہ یاب ہو۔ ان کی انفرادی اور جماعتی زندگی کے معیاروں کو ہندی نظام میں جگہ ملے، اور ہندی زندگی ان کے برکات سے مالامال ہو۔ اسلام کی حیات بخش روح پرور تعلیم پر کسی گروہ کا اجارہ تجارتی نہ رہے بلکہ ساری ہندی قوم اس چشمۂ فیض سے اپنی تشنہ کامی دور کر سکے۔ دیانت، خلوص، مروت، خدمت و ایثار کی ایسی مثالیں قومی زندگی کو بخشیں کہ قوم احسان مندی سے انھیں اپنی سربلندی کا سرمایہ جانے اور ان کی یاد سے قومی سینہ مہر و وفا کا گلزار بن جائے۔

ہے تو مشکل کام، لیکن سچے مسلمان کا حوصلہ اس سے کم پر راضی نہیں ہوتا — اور میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانان ہند کے لیے اس حوصلے کو پورا کرنے کی سبیل علی گڑھ نکال سکتا ہے۔ مسلمانانِ ہند کو اِس فریضۂ عظیم کو ادا کرنے اس مقصد بلند کے حاصل کرنے کے قابل بنانے کا مرکز علی گڑھ کا دارالعلوم ہو سکتا ہے۔ اِس کے بنانے میں مسلمانوں کی محبت، محنت، دولت، اور بہت کچھ جوش اور خلوص کام آیا ہے ......!

"میرا تو یقین ہے کہ علی گڑھ کو قومی زندگی میں بڑا کام انجام دینا ہے۔ وہ کام ہندستانی تدبر اور ہندستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے۔ یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام، اور اس کی زندگی میں چار کروڑ مسلمان شہریوں کا حصّہ اور مقام، علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڑھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے خدمت کی جو پیش کش دے سکے گا، اس سے متعین ہوگا ہندستانی قومی زندگی میں علی گڑھ کا مقام" اور ہندستان جو سلوک علی گڑھ سے کرے گا، اس پر ہاں، اِس پر، بڑی حد تک منحصر ہوگی۔ وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔

"مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں .... اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصّہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں بھی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندستانی کی حیثیت سے بھی اس بات پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا ــــ گلستاں میرود اگر میرم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندستانی قومیت کے لئے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں، ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندستانی قوم کا جزو بننے پر فخر کرتے ہیں، مگر وہ ایسا جزو بننا

کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں، اور اچھے ہندی۔ اور کوئی مسلمان اپنے ہندی ہونے پر شرمائے اور نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے۔“

حال ہی میں ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی حاصل عمر کتاب میں لکھا ہے:

اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں مسلمان طالب علموں کی تعداد میں جو کمی ۱۹۴۷ء کے بعد ایک دم سے ہوئی تھی اس میں مسلم یونیورسٹی کے سوا کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان طبقوں کی جو اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلاتے تھے، مالی حالت، خاص کر شمالی ہند میں، اب اس قابل نہیں کہ وہ اس کا بھاری خرچ اٹھا سکیں۔ جو طبقے اب خوشحال ہو گئے ہیں ان میں ابھی تک تعلیم کا شوق ابھرنے نہیں پایا ہے۔

یہ ذہنی پستی جو مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کی کمی کے سبب پیدا ہو رہی ہے، ان کی معاشی پستی سے کم خطرناک نہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو انھیں وہ قیادت کبھی میسر نہیں آئے گی جو اس نازک دور میں ان کی رہنمائی کر سکے اور انھیں نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بنا سکے۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ ان کی تنگ نظری اور تاریک خیالی بڑھتی جائے گی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ احساس محرومی، بیزاری اور مایوسی میں بھی اضافہ ہوگا۔ اور ان نفسی امراض کی وجہ سے ان کی عملی قوتیں شل ہو کر رہ جائیں گی۔ وہ ملک کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں مدد دینے کے بجائے اپنے لئے ملک کے لئے اور دنیا کے لئے ایک بوجھ بن جائیں گے“

بدرالدین طیب جی نے کہا تھا، علی گڑھ آتے وقت بھی اور جاتے جاتے بھی:

”یہ یونیورسٹی دنیا میں سب سے بڑا اور سب سے ہمہ گیر اسلامی ادارہ ہے....

اس کا بنیادی مقصد اسلامی تہذیب، افکار، اور روایات کی تحقیق اور تعلیم و تدریس کو ترقی دینا ہے اور اس کی تحقیقات کہ ان روایات و افکار نے ہندوستانی تہذیب کی تشکیل اور عالمی افکار کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ علی گڑھ کوئی فرقہ داری ادارہ ہے۔ مگر یہاں تعلیم کے لئے آنے والوں سے ہم اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ وہ کسی بھی مسلک فکر کے ساتھ آئیں، وہ ایسے ضرور ہوں کہ ہندوستانی تہذیب کے ارتقا میں اسلامی روایات و افکار کے اہم رول کی قدرشناسی کر سکیں، ان روایات و افکار کے تحفظ کے لئے کوشاں ہوں — اور اگر وہ اس میں خوبی پائیں تو اس کی اشاعت اور پھیلاؤ میں دلچسپی بھی لیں!

" یہاں نتائج اور نمونوں کے ذریعہ دکھایا جاتا ہے کہ آزاد ہندوستان کیلئے اس قسم کے اسلامی ادارے کے لئے آرزومندی، اس کی دیکھ ریکھ اور اس کیلئے ترقی کے مواقع نکالنا کس قدر ضروری ہے محض اس لئے بھی کہ ہندوستانی طریق زندگی یا ہندوستانی تہذیب کو، جس کا ہم اتنا مان دان کرتے ہیں، باقی رکھنا اور مزید ثروت مند بنانا ہے۔

" علی گڑھ یونی ورسٹی اتنی مسلم یونی ورسٹی نہیں — تیس فیصدی طلبا غیر مسلم ہیں۔ جتنی ایک عظیم اسلامی ادارہ ہے۔

" میرے نزدیک کشمیر اور بعض اعتبارات سے کشمیر سے بھی زیادہ علی گڑھ (یونیورسٹی) وہ مرکز ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کو بلا شرکت غیرے ایک نادر موقع فراہم کرتے ہیں، اس بات کا کہ وہ قومی اور تہذیبی ہم آہنگی کا نظریہ سے بڑھ کے عملی ثبوت دے سکیں اور اس طرح اس کے حقیقی معنی بتا سکیں۔ دونوں جگہ اکثریت میں ہونے کے سبب وہ سارے ہندوستان کو اور اسلام میں دلچسپی رکھنے والے، ممالک کو یہ دکھا سکتے ہیں کہ انسانی ارتقا میں رواداری کے مناہج میں نئے تصورات کو جذب

کرنے اور پھر دوسروں کو روشنی بخشنے میں اسلام کا کتنا شاندار رول ہو سکتا ہے مختصراً یوں کہوں کہ نہ صرف یہ بات نکھر کے سامنے آجائے کہ اسلام کا ہندستانی تہذیب کی تشکیل میں ایک اہم حصہ ہے بلکہ یہ بات بھی کہ اسلام کے پاس اب بھی ہندستانی تہذیب کے نکھار کے لئے بہت کچھ ہے"۔

اور عرصہ ہوا خواجہ غلام السیدین نے علی گڑھ کی تعلیمی تحریک پر ایک عمدہ مقالہ لکھا تھا، اِس مقالے میں بڑی خوبی کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ علی گڑھ میں، اور ایک عام یونی ورسٹی میں کیا فرق ہو سکتا ہے۔ مختصراً یہ کہ:۔

اس نے سب سے پہلے مسلمانوں میں قومی تعلیم کا احساس اور خواہش پیدا کی۔ اس کی بنیاد اعتمادِ نفس اور امداد ذات کے اصول پر تھی؛

اس نے مشرقی تہذیب اور مغربی تمدن میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی؛

اِس نے ملک کے نظام تعلیم میں مذہب اور مذہبی تعلیم کی اہمیت کو پہچانا اور پہچنوایا۔ اس کا ایک مقصد اعلیٰ یہ بھی تھا کہ نوجوانوں میں دنیاوی ترقی اور عزت کی خواہش کے ساتھ "حیات اخروی کا یہ احساس" مستحکم کیا جائے، تاکہ ان کی زندگی نفسانیت اور جاہ طلبی کے اغراض کے لئے وقف نہ ہو جائے بلکہ وہ اس کو اعلیٰ ترین مقاصد کے لئے جدوجہد میں صرف کرے؛

اس نے عقلی تعلیم کے ساتھ تربیت سیرت کی ضرورت کو سمجھا؛

اس نے تحریک عزت نفس پیدا کرنے کی کوشش کی، اعتماد ذات کے اصول پر زور دیا اور طلباء کو رواداری اور وسعت قلب کا سبق سکھایا، خدمت میں عظمت کا راز کھولا؛ اور ـــ" اس تحریک کی ایک آخری اور نہایت اہم خصوصیت یہ بھی کہ یہ وسیع ترین معنوں میں تعلیمی تحریک تھی۔ یعنی اس کا تعلق محض لکھانے پڑھانے یا علوم سکھانے سے نہیں تھا بلکہ اس کا منشاء یہ تھا کہ مسلمانوں میں

ایک عام ذہنی بیداری پیدا کی جائے، ان کی معاشرت اور تمدن میں ضروری اصلاح کی جائے۔ ان میں قومیت اور یک جہتی کا احساس پیدا کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے مخصوص اصول و روایات اور اپنے بلند نصب العین کا دامن مضبوط تھام کر اپنی دنیاوی وجاہت اور عزت کو دوبارہ حاصل کریں۔"

" اس لئے ہم اس تحریک کا اصل مفہوم اور اس کی پوری اہمیت اس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک ہم ان تمام شعبوں کو ذہن میں نہ رکھیں اور یہ نہ سمجھیں کہ مسلم یونی ورسٹی کے قیام کا مقصد مسلمانوں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی قومی خودی حاصل کرکے اپنے وطن کے بہترین اور مفید ترین شہری بن سکیں۔ تحریک کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ اس کو قومی زندگی کی کش مکش اور زندہ مسائل کی جدو جہد سے بچا کر ایک شیشہ کے گھر میں نشو ونما دی جائے جس طرح بعض حرارت پسند پودوں کو گرم خانوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے! اگر یونی ورسٹی کی علمی زندگی کو قومی ضروریات قومی مفاد اور حیات قومی سے مسائل سے بُعد پیدا ہو گیا، اگر ان دونوں کے درمیان جو رشتہ اور رابطہ ہونا چاہیئے وہ ٹوٹ گیا، تو اس سے وہ حرکت اور زندگی بخشنے والا عنصر مفقود ہو جائے گا جو تعلیم کو بجائے فرسودہ مضامین پڑھانے تک محدود کرنے کے، حیات برتر کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے۔"

اور علی گڈھ کی تاریخ شاہد ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے حیات قومی کے مسائل سے آنکھیں چرائی ہوں۔ ادب، سیاست، اصلاح معاشر اور تعمیر قومی کے ہر موڑ پر علی گڈھ کا فرزند ضرور ملے گا اور ایک ممتاز مقام پر ملے گا۔

علی گڈھ محض ایک یونیورسٹی نہیں میرے دوستو! علی گڈھ ایک تاریخ ہے علی گڈھ ایک روایت ہے، ایک تہذیب ہے۔ اس کی الحمرا جیسی سُرخ

عمارتوں میں کئی نسلوں کے خواب آدیزاں ہیں، اس کے بوڑھے یوکلپٹس کے پیڑوں کی ہواؤں میں سر سید اعظم سے لے کر ذاکر حسین اور طیب جی تک کے مسرور اور مطمئن انفاس ملے ہوئے ہیں۔

یہ ملت اسلامیہ کا سب سے بڑا کارنامہ اور سب سے شاندار خوابیہ ہے جس میں ان کا صدیوں کا جمع شدہ ورثہ سمٹ آیا ہے۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا نشان ہے اور ان کے لئے قومی تعمیر میں حصہ لینے کا سب سے اہم پلیٹ فارم علی گڑھ ہندستانی مسلمان کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ آج سے نہیں ہمیشہ سے۔ مگر آج کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس لئے ہے کہ علی گڑھ کے سوا اس کے پاس کچھ بچا ہی نہیں۔ اسکے سارے خواب ایک ایک کر کے چکنا چور ہوتے گئے ہیں۔ علی گڑھ اس کی عزت اور وقار کا ذریعہ بھی ہے، نشان بھی شاید پاسبان بھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ مسلم کا لفظ نہیں لگنا چاہیئے، اس سے فرقہ پروری کی بو آتی ہے۔ کیا مسخرا پن ہے۔ اسے خوشامد یا ذہنی دیوالیہ پن کے سوا اور کس بات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ عابد رضا بیدار کو اپنے کو مسلمان نہیں کہنا چاہیئے اس لئے اس سے فرقہ پروری کی بو آتی ہے۔ ہندستان میں مسلمان کو داڑھی نہیں رکھنا چاہیئے اس لئے کہ اس سے فرقہ پرست معلوم ہوتا ہے۔ عبدالعلیم نام نہیں رکھنا چاہیئے اس لئے کہ اس سے ایک فرقہ سے وابستگی جھلکتی ہے۔ نماز نہیں پڑھنا چاہیئے حج نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ محض ایک فرقہ کے متعلقات ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں آپ کی منطق کا سرا صرف مسلم یونیورسٹی تک رک جائے گا؟

دوستو! اتنے نیچے مت گرو کہ برادران وطن بھی تمہیں حقیر سمجھنے لگیں۔ قومی تعمیر میں ان کے ساتھ برابر قدم ملا کے چلو، عزت کے ساتھ سربلندی کے ساتھ،

یہ دیس تمہارا ہے۔ یہاں تمہیں باعزت زندگی گزارنے کا دستوری حق ملا ہے۔ تم عزت کی زندگی پر ذلت کی موت کو ترجیح دینے پر تلے ہوئے ہو۔ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ ذلت کی موت کیا ہے؟ ذلت کی موت ہے اپنے حقوق کو بھیک سمجھنا اور اپنے فرائض کو جبر۔ اور کیا میں مزید واضح کروں کہ تم ٹھیک انہیں خطوط پر چل رہے ہو وہ خطوط جن پر زندہ مردے چلتے ہیں !!

مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آرڈیننس صحیح ہے یا غلط، نہ اس سے واسطہ ہے کہ آئندہ پارلیمنٹ میں پاس ہونے والا ایکٹ اس سے نرم ہو یا گرم (یا بالکل نہ ہو) میں تو اس بنیاد کی بات کرتا ہوں جہاں سے سب طوفان کھڑے ہوتے ہیں :

- ہندستان کے ایک ممتاز انگریزی روزنامہ پیٹریٹ نے حادثہ (۱۹۶۵ء) کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنی طرف سے یہ جملہ اضافہ کر دیا کہ چند دن پہلے پاکستان ہائی کمیشن کے ایک اعلیٰ افسر کا علی گڑھ میں ورود ہوا تھا، بعد میں یہ بات ہر اخبار میں اور ہر بیان میں نقل ہوئی۔ یو۔پی اسمبلی میں دوہرائی گئی اور پندرہ بیس دن بعد اس کی تردید ہوئی۔
- ایک ممتاز قوم پرور۔ نے تیسرے دن اپنی چشم دید اور گوش شنید تحقیقات کی بنا پر بیان دیا کہ علی گڑھ فرقہ پرستوں کا گڑھ رہتا ہوا ہے اور موجودہ واقعات میں ان کا خاص رول ہے اور پاکستانی اندازِ فکر وہاں عام ہے۔ اور جب ان کی یہ بات خوب پھیل گئی تو انھوں نے معمولی سے رد و بدل کے بعد اس کی گویا تردید بھی کی۔
- یو۔پی کے چھ ممتاز غیر مسلم ممبران اسمبلی از خود علی گڑھ گئے اور واپس آ کے جو بیان دیا اس میں فرقہ پرستی کی طرف اشارہ تھا نہ پاکستانی عناصر کا ذکر تھا نہ پاکستانی جھنڈا۔

سرت طلبا کے مطالبے اوران کی بدتمیزی کا تذکرہ تھا ۔ اس رپورٹ کو ملک کے بڑے حصے نے منظرانداز کر دیا اور بعد میں کسی جگہ اس کا حوالہ تک نہیں دیا گیا۔ یہ پیٹریٹ میں شائع ہوئی تھی۔

• "یو،پی اسمبلی کے سرکاری ۶ رکنی کمیشن نے جو رپورٹ دی اور جس کے بعد آرڈی نینس بنا، اس کے ایک ممتاز ممبر نے بعد میں لکھا کہ اس رپورٹ میں یہ حصے شامل تھے:۔

(۱) "ہم کو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یونیورسٹی کے طلبار کی بہت بڑی اکثریت کا ایجی ٹیشن سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

(۲) کرنل زیدی نے اسٹاف کے ایک گروہ پر اس ہنگامہ میں آلودگی کا جو الزام لگایا ہے، وہ نہایت نامناسب ہے، اور بغیر کسی تحقیقات کے جاری کیا گیا ہے"

مگر کمیشن کی رپورٹ کا خلاصہ انگریزی پریس آیا، اور یہ تردید صرف اردو پریس کی زینت بنکر رہ گئی۔

• آرڈی ننس پاس ہونے کے بعد اخبارات کو اشاعت کیلئے دیا گیا تو کسی متعلقہ افسر نے اس کی تمہید میں وہ سارا آتش فشاں زہر بھر دیا جو علی گڑھ کو بھک سے اڑا دے۔ اس میں کہا گیا کہ

(۱) علی گڑھ پاکستان دوست سرگرمیوں کا گڑھ ہے۔ اور

(۲) علی گڑھ فرقہ پرستی کا اڈا ہے۔ اور اس کی تفصیل بھی کی گئی۔

دوسرے تیسرے دن جب ان صریحی غلط بیانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی تو وزیر تعلیم نے جواب دیا کہ یہ غلطی سے کسی شخص نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے، اور یہ نہ تو وزیر تعلیم کا ارشاد تھا نہ آرڈیننس کا حصہ چھپی ہوئی۔ اس کے بعد اس

ہمایسی غلطی کرنے والے سے نہ پوچھ گچھ ہوئی، نہ یہ معلوم ہوا کہ آخر اس تمہید کے اضافے سے اس کا کیا مقصد تھا۔ وزیر تعلیم نے اُسے محکمہ کی غلطی کہہ کے ختم کردیا اور اس کے نتائج کا اندازہ نہیں لگایا کہ پورے ہندستان میں علی گڑھ کے اور مسلمانوں کے خلاف جو زہرناکی پھیلی ہوئی ہے اس کو اس بیان نے کئی ہزار گنا کردیا۔ یہ ایسا زہریلا بیان تھا جس پر سینکڑوں جبلپور، گورکھپور اور راوڑکیلا جلا دیے جاتے۔ اور جب یہ ہوا تو وزیر تعلیم کہتے ہارے، اتنی سی غلطی سے یہ کچھ ہوگیا!

• آرڈیننس کے پاس ہونے کے بعد اس کے خلاف جو ردِعمل ہوا، اور پورے ہندستان کی مسلم رائے عامہ چھاگلہ جی سے ہی نہیں، کانگریس سے بھی بددل ہوگئی اور ہورہی ہے، اس کا اندازہ یہ لوگ ہنوز نہیں کرپائے، اور یقیناً یہ ملک کے لئے اچھا نہیں ہوگا اگر اگلے الیکشن میں مسلم پارٹنگ، سوتنتر یا جن سنگھ کی طرف جھک گیا۔ اس لئے اچھا نہیں ہوگا کہ سترہ اٹھارہ سال کی ساری کمائی ڈوب جائے گی اور ملک سیکولر اشتراکیت کو چھوڑ کے کسی اور گھٹیا راہ پر لگ جائے گا۔

• خود علی گڑھ کے اسلام پسند اور کمیونزم پسند اساتذہ سے میری عرض ہے کہ آپ لوگ اتنے پڑھے لکھے ہو کر اختلاف رائے کو اتنا شدید بنا دیتے ہیں کہ ایک دوسرے کی رائے اور نظریہ زندگی کا احترام نہیں کرسکتے تو آپ میں اور عام جاہلوں میں کیا رہ جائے گا۔ علمی اور تعلیمی ماحول میں تو خصوصاً اس کا موقع ہو کہ ہر نظریہ اور نقطہ نگاہ رکھنے والے کی کھپت ہو، تفہیم و تفہم ہو جس کے نتیجہ میں مفاہمت پیدا ہو سکتی ہے۔ اور نہ بھی ہو تو کیسا ضروری ہے کہ مجھے مچھلی پسند ہے تو دوسرے کو مرغ پسند ہو۔ یا مجھے ٹیگور پسند ہے تو دوسرے کو بھی ٹیگور ہی پسند آئے، شکسپیر کیلئے کوئی گنجائش نہ نکلے، یا مجھے روشنی جلا کے نیند آتی ہو تو اصرار کروں کہ

روشنی بجھا کے سونے والا احمق ہی۔ اعلیٰ دانش گاہوں کے۔ دانشمند اساتذہ اور ان کے پروردہ دانش جو بھی اگر ایک دوسرے کو چھوٹ دے کے بات نہ کریں گے تو پھر کس سے توقع ہوگی۔ کوئی شخص بذاتہٖ دنیا میں عقل کل نہیں ہے۔ اُسے دوسروں سے کچھ سیکھنا ہوتا ہے۔ اور ہم مسلک ساتھیوں سے اتنا کچھ نہیں سیکھا جا سکتا جتنا اختلاف یا مخالفت رکھنے والوں سے سیکھا جا سکتا ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اختلاف کو مخالفت کی حدود تک نہ جانے دیں۔ اور دوسرے یہ کہ اختلاف کو بھی اپنے منصب کی مناسبت سے علمی رنگ دینے کی کوشش کریں۔ سیاست پورے مسلم معاشرے کے لئے زہر کا درجہ رکھتی ہے اور آپ کیلئے بدرجۂ اولیٰ۔ آپ سیاست کو دوسروں کیلئے چھوڑ دیجئے اور اپنے طلبار کے ذہن بنایئے اس طرح کہ قوم کے سچے خادم بن سکیں جب وہ علمی گڑھ سے نکلیں تو ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا زہر لے کے نہ نکلیں بلکہ تعلیمی ماحول سے نکلتے ہی سماج شدھار اور خدمت خلق کیلئے اس طرح ٹوٹ پڑیں جیسے دنوں کے پیاسے کو پانی نظر آجائے۔

قبائے زندگانی چاک تا کے	چو موراں آشیاں درخاک تا کے
بہ پرواز آو شاہینی بیاموز	تلاش دانہ درخاشاک تا کے

—— یہ شبہ کہ ۱۹۵۱ء کے ایکٹ نے مسلم یونیورسٹی کے کردار میں بنیادی تبدیلی کردی ہے محض وہم ہے ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کے بعد ۱۹۶۱ء کی انکوائری کمیٹی کی رپورٹ بھی آئی ہے اور کوئی بھی معمولی سمجھ کا آدمی اسے پڑھ کے یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ کمیٹی کے نزدیک یہ ایک مسلم ادارہ نہیں ہے۔ مزید براں آزاد قوموں میں قانون سے زیادہ احترام ان روایات کا ہوتا ہے جو صدیوں سے چلی آتی

ہیں۔ یہ روایات اور کنونشن آئین کے ساتھ ساتھ ایک اور آئین بن جاتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کے کسوٹی قوم کا ضمیر ہوتا ہے وہ جتنا کھوٹا ہوگا، قوم کا دستور بھی اسی تناسب سے کھوٹا ہوتا چلا جائے گا اور قوم کے کنونشن اور اس کی روایات ہوا میں اڑ جائیں گے۔ لیکن اگر قومی ضمیر زندہ ہے تو ہر صداقت کی سب سے بڑی ضمانت یہ خود ہوگا۔

علی گڑھ کی روایات ۱۹۵۱ء سے زیادہ پرانی ہیں یہ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ سے بھی زیادہ پرانی ہیں۔ یہ قلم سے نہیں خونِ جگر سے لکھی گئی ہیں۔ یہ کاغذ پر نہیں، دلوں پر نقش ہیں۔ علی گڑھ کے سلسلے میں مسلم کردار کے کیا معنی ہوں گے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو ایک اولڈ بوائے اور ایک ہندستانی شہری ہونے کی حیثیت سے اتنا جانتا ہوں کہ علی گڑھ کی جو روایات بن چکی ہیں، ان میں سے ہر روایت کو جب تک کہ تاریخ کا غیر محسوس ہاتھ محو نہ کردے باقی رہنا چاہیے یہی اس کا کیرکٹر ہے، جس کا باقی رہنا ضروری ہے۔

علم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اور یونی ورسٹیاں علم سکھانے کے لئے ہوتی ہیں، تبلیغ مذہب کے لئے نہیں۔ لیکن علم سیکھنے کے واسطے آنے والوں کی کچھ تہذیبی اور معاشرتی بنیادیں ضرور ہوتی ہیں۔ احساسات، جذبات، خیالات، تصورات چیزوں کی اچھائی برائی کو پرکھنے کے پیمانے، زندگی کی اقدار، لوگوں سے بیوہار، بچپن کی کہانیوں سے لے کر عہد شعور میں ان کے ذہنوں میں رچی ہوئی تہذیبی روایات تک، یہ سب ان کی BASE ہوتی ہے کسی سے آپ اس کی BASE چھین لیجئے تو وہ کھوکھلی عمارت ہو کر رہ جائے گا۔ یہ اس کے لئے تو برا ہی ہی

قومی حیثیت سے بھی بڑا ہے۔ بس ان روایات کا تحفظ اور ان کو پروان چڑھانے میں مدد دینا ــــ یہ ہے علی گڑھ کا کیرکٹر۔

اور اس کیرکٹر کی بقا کیلئے یونی ورسٹی، چڑجی تحقیقاتی کمیٹی کے بقول اپنی داخلہ پالیسی اور اپنی تمام اندرونی پالیسی کے بارے میں معیار اور نفاست کے اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے پوری طرح آزاد ہونی چاہیئے ورنہ اسی کے بقول اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اگر وہ اپنے بنیادی مقاصد کو پورا کرنے میں ناکام رہی!

اور اس کے لئے ضروری ہے کہ، کورٹ اور عاملہ میں ہندو مسلمان سب کو لیا جائے جو ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے ترقی پسندانہ رول کے معترف اور قدرشناس ہوں، اور اس بات کو بھی جانتے ہوں کہ قومی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک طبقہ کو مزید پسماندہ نہ بنایا جائے۔

(۲)

اب سے تین سال پہلے میں نے یہ سب کچھ لکھا تھا اور اس تحریر کو من وعن چھاپنے میں آج بھی کسی بنیادی ترمیم کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔

البتہ اب مسئلہ جس طرح چھڑا ہے وہ بالکل دوسری نوعیت اختیار کرچلا ہے۔ اب ہندستانی مسلمان علی گڑھ کے توسط سے اپنی assert identity کرنے کے درپے ہیں۔ اس میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء تک جو developments ہوئے ہیں، ان کو خاصا دخل ہے خصوصاً مندرجہ ذیل کی جانب اشارہ کرنا چاہوں گا۔

(۱)۔ مجلس مشاورت کے بطن سے مسلم مجلس کی پیدائش۔ اور ڈاکٹر فریدی کی شخصیت میں ایک مخلص لیڈر مل جانے کے سبب اس کا قد یکایک بہت بڑھ جانا۔

(۲)۔ مسلم لیگ کا یو، پی اور دہلی میں ریاستی شاخیں قائم کرلینا۔

(۳)۔ کانگریس کا مرارجی گروپ اور اندرا گروپ میں بٹ کے دو پارٹیاں بن جانا۔ اور مسلمانوں کا پاسنگ مزید وزنی ہوتے جانا۔

(۴)۔ احمد آباد۔ جلگاؤں اور بھیونڈی کے سلسلے۔

ان سب باتوں کے نتیجہ میں پچھلے دنوں ہم جن امور پر بڑی حد تک متفق ہوا کرتے تھے، اتحاد فکر کا وہ سہلو پارہ پارہ ہے۔ ہم متفق تھے کہ نہرو، آزاد اور ذاکر حسین نے اڑے وقت میں، جب کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا تھا، علی گڑھ کو بچایا۔ ہم متفق تھے کہ تہذیبی اور سیاسی امور میں آزاد اور ذاکر حسین کے توازن، اعتدال

سوجھ بوجھ اور سب سے بڑھ کے اسلامی ہندستانیت یا ہندستانی اسلامیت سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

مگر ۱۹۷۰ء کے نصف آخر میں، لگتا ہے، مسلمانوں کے یہ رہنما اب ان کے لئے asset کے بجائے liability بن گئے ہیں، پیر تسمہ پا جنھیں وہ پہلی فرصت میں اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔

اور اس کی علامت ان کا یہ مطالبہ ہے کہ علی گڑھ کو آزاد اور ذاکر حسین کا دیا ہوا ۱۹۵۱ء کا وہ ایکٹ نہیں چاہیئے جس کی رد سے یونیورسٹی کے انتظامی اور اکا ڈیمکی اداروں اور عہدوں پر، طلبا اور اساتذہ ہیں، غرض ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی شامل ہو سکیں (جیسا کہ ہوتے رہے ہیں) اور اس کے لئے مہارا انھیں فخرالدین علی احمد نے ایک نام نہاد کمیٹی قائم کر کے اور اس سے ایک رپورٹ وصول کر کے بخش دیا۔

سچ مچ کسی پیاسے کو اپنی پیاس بجھانی ہوتی ہے تو وہ شیشہ کے شفاف گلاس میں پانی پینے سے پہلے نہ کبھی پوچھتا ہے، نہ خود قرار دیتا ہے کہ یہ گلاس ہندو ہے یا مسلمان! تعلیم کی عظیم درسگاہوں میں علم کے پیاسے گھونٹ دو گھونٹ پینے پہنچیں، اور ان میں کسی سے کہا جائے کہ یہ گلاس ہندو کا ہے، کسی سے کہا جائے یہ گلاس مسلمان ہے تو۔ پینے والے سے پہلے خود کہنے والے کو اس کے لئے کتنی بڑی اخلاقی آزمائش سے گزرنا ہوتا ہوگا!

ہندو پانی اور مسلمان پانی، ہندو ہوا اور مسلمان ہوا، ہندو پھول اور مسلمان پھول، ہندو انسانیت اور مسلمان انسانیت، ہندو خدا اور مسلمان خدا،

یہ سلسلہ پھر کہیں رُکے گا نہیں۔

اور ہم کہ ہم نے اپنے مقدس ورثہ میں یہاں تک پڑھ رکھا ہے کہ اور تو اور، خود لفظ اسلام تک اپنے مذہب کے لئے معرفہ کی حیثیت سے استعمال کرتے ہو تو حماقت ہے، یہ تو ایک صفت ہے، اور یہ کہ تمہارا مذہب محمدؐ سے شروع نہیں ہوا۔ وہ تو جب سے انسان شروع ہوا ہے، اسی وقت سے ہے۔ جتنے مذاہب تھے سبھی اسلام تھے؛

ہم جنھوں نے کہ دین اور مذہب تک کو اپنی جاگیر نہیں بنانا چاہا، ہم آدمی کو انسان بنانے کے تہذیبی ذریعہ تعلیم کو کیسے مسلم تعلیم اور ہندو تعلیم میں بانٹ سکتے تھے، ہم تعلیم کی درسگاہوں کو ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی کے نام دے کر خود اپنے دین سے اس کی جہانگیری سے اس کی انسانیت کے پیغام سے صرف نظر کیسے کر سکتے ہیں۔

لیکن زمان و مکان میں محدود، حقیر انسان، بہت کچھ ایسی باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس پر اس کا دل روتا ہے۔

آزادی کیلئے ایک صبر آزما جنگ لڑی گئی۔ تو انسان دوست عالمی نقطۂ نظر کے مقابل میں قوموں کے نام سے بُت بنا کے لے آئے گئے۔ انسان ہار گیا مسلم قوم پرستی اور ہندو قوم پرستی کے بت تراشوں کی جیت ہوئی اور چراغ گل ہو گئے، ستارے بجھنے گئے، اندھیرا بڑھتا گیا۔

اور ہم آزاد ہوئے تو اس طرح کہ ہمارے دونوں بازو ہم سے کٹ کے اپنے کو ایک الگ وجود قرار دے چکے تھے، اور پھر دھندلکا چھٹا تو ہم نے دیکھا کہ ہم

کیا کر چکے تھے۔ مسلمانوں کا قومی گھر بن چکا تھا۔ اس کے باوجود مسلمان اس گھر میں موجود تھے جو انھوں نے بظاہر ہندوؤں کے لئے بطور ان کے قومی گھر کے باقی چھوڑ دیا تھا۔ ان کے سروں کا سایہ ان کا آسمان قومی بت تراشش اپنے ساتھ لے کے چلے گئے اور ان کے پیروں تلے کی ساری زمین پہلے ہی کھسک چکی تھی۔ ایسی بے رحم لاچاری اور بے بسی سے تو انھیں ۱۸۵۷ میں بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔

ایسے میں ان سے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اسلام اور مسلم کا نام آج سے بند! اس سے یا تو ایک طویل خانہ جنگی چھڑ جاتی یا گھٹنوں میں سر دے کر یہ کمیونٹی الگ تھلگ ایک کونے میں معتکف ہو رہتی اور آزاد ہندوستان اپنی تعمیر میں ۶، ۷ کروڑ اہلیت اور صلاحیت رکھنے والے باعزت شہریوں کے پُرخلوص اور جذباتی تعاون سے ہمیشہ کے لئے محروم رہ جاتا۔ ایسے میں وہی کیا جا سکتا تھا جو ہوا۔ اور اتنے ہی وسیع النظر، دور اندیش اور devoted ہاتھوں سے ہو سکتا تھا جن سے کہ ہوا۔ اور ذاکر صاحب، زیدی صاحب اور طیب جی کے علی گڑھ چھوڑنے تک ۱۹۶۲ء کے آغاز تک، تقریباً ۱۴ سال تک مسلمانوں کی جذباتی Rehabilitation کا کام بڑی لگن سے جاری رہا۔ انھوں نے دیکھا کہ آزاد ہندوستان میں ان کی قیمتی میراث جو ایم۔ اے۔ او کالج سے پروان چڑھ کر مسلم یونیورسٹی بنی تھی، اب بھی یونیورسٹی ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ۳۔۴ لاکھ سالانہ کی حقیر برطانوی گرانٹ پر جینے والی مسلم یونیورسٹی کو اب ان کی قومی حکومت کی طرف سے ۲۰،۰۰،۰۰۰ لاکھ سالانہ ملنا بھی معمولی بات

ہو گئی (اور جلد ہی نوبت سو لاکھ تک پہنچنے والی تھی)، انھوں نے دیکھا کہ مسلم یونیورسٹی ہی کا نوزائیدہ اس کا فرزند ڈاکٹر ذاکر حسین اس کا نگران اعلیٰ بنا کے بھیجا گیا ہے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ فرزند علی گڑھ ایک اہم صوبے کا گورنر بنا دیا گیا، اور علی گڑھ کی روایات سے برسہا برس وابستہ ایک اور ممتاز قومی کارکن کرنل زیدی، پیشرو کی روایات قائم رکھنے کے لیے آ گیا۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ تیسرا جانشین تو انھیں ہندوستان سے وابستگی اور زمین سے پیار کی ایسی زنجیریں پہناتا جا رہا ہے کہ ذاکر حسین کو بھی رشک آئے۔ حوصلے، عزم، اطمینان، سکون اور اعتماد کے ساتھ علی گڑھ کا قافلہ متوازن اور معتدل انداز پر، سیکولر طریق فکر کو اپنا کے ہندوستان کی تعمیر میں اپنا حصہ بٹانے کے لئے تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

اور علی گڑھ کے توسط سے پوری مسلمان کمیونٹی میں دلوں کا اعتماد بحال ہو رہا تھا کہ۔

ہندوستانی سیکولر فکر کو معنویت دینے والی عظیم شخصیت مئی ۱۹۶۴ء میں اپنے سے عظیم تر کے بلاوے پر، بلا کہے سنے نئی منزلوں کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کے جانشین اور جانشین کے حواری اس عالمی نظر سے محروم تھے جو اشیاء اور امور کو وسیع تر اور دور رس پیش منظر اور پس منظر میں دیکھ سکتی تھی! نتیجہ میں اندوہناک اقدامات کا ایک سلسلہ تھا جو ایسا جاری رہا کہ عواقب آج تک بھگتا کر رہے ہیں۔ نہرو کے فرستادہ عبداللہ کے ہند پاک دوستی کے مشن کا خاتمہ پہلا اقدام تھا، راجہ سے زیادہ راجہ رام، کا وزارت تعلیم پر تقرر

دوسرا اقدام تھا؛ نواب علی یاور جنگ کا علی گڑھ کے سردار اعلیٰ کے طور سے انتخاب تیسرا اقدام تھا۔ چوتھی منزل ہند پاک آویزش کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی جو ہو کر رہی اور دونوں قوموں میں، جو ہم آہنگی کی فضا پیدا ہوتی چلی تھی اُسے پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

نواب بہادر کے زمانے میں یونیورسٹی کی خود مختاری پر ایک ضرب کاری کے طور سے پہلے تو ۲۰ مئی ۱۹۶۵ء کو ایک آرڈیننس بنا اور پھر ستمبر میں اسی کو نمونہ بنا کے ایک ایکٹ پاس کر دیا گیا۔ جنگ علی گڑھ پہنچے تو ہر طرف جنگ ہی جنگ چھڑتی چلی گئی، علی گڑھ میں طلبا اور وائس چانسلر کی جنگ، کشمیر، لاہور اور سیالکوٹ میں ہند، پاکستان کی جنگ، ایمرجنسی کے موقع پر ایسا ہی ایکٹ بن سکتا تھا، جیسا کہ بنا۔ اور مجھے کوئی اعتراض نہیں اگر وہ ایمرجنسی کے خاتمہ کے ایک عرصے بعد تک بھی، آج ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء تک جاری رہا ہے۔

لیکن آج میں پوچھتا ہوں کہ ایمرجنسی ختم کر کے علی گڑھ کو ۱۹۶۵ء سے پہلے کے حال پر کیوں نہیں لایا جا رہا؟

آج مجھے اعتراض کا حق پہنچتا ہے ـــــ یہ حق اس لئے پہنچتا ہے کہ آج سے پہلے میں نے اعتراض نہیں کیا جب کہ ایمرجنسی کے خاتمہ کے بعد ایمرجنسی کے ہر اقدام پر نکتہ چینی میرا حق تھا، شاید یہ میرا فرض بھی تھا! اور، یہ حق اس لئے پہنچتا ہے کہ مسلمان کمیونٹی کے جذباتی انکے اندر اعتماد کی بحالی، اور اس لئے برابر کے شہری کی حیثیت سے وطن کی تعمیر کی پُرخلوص لگن میں

جو شاندار فطری ارتقا ہو رہا تھا ۱۹۶۵ء نے اس کی طنابیں اس طرح کھینچیں کہ سب کچھ زمین پر آ رہا۔ گھڑی کی سوئی پیچھے کی طرف لوٹا دی گئی۔ (اور اورنگ زیبیوں کی طرح اس پر اصرار بھی کیا جا رہا ہے)

آج نام کی ضرورت، اس لئے، پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ مبادا frustration اور demoralization اس حد تک نہ پہنچ لے کہ Rehabilitation مشکل ہو جائے۔

میں اس کے اقامتی کردار پر بھی اصرار کرتا ہوں، اس لئے کہ اسی کی بدولت وہاں وہ تعلیمی فضا بن سکی ہے کہ علی گڑھ کا نام اعلیٰ معیار کی ضمانت بن گیا ہے۔

اسی طرح میں اس کے مخصوص کردار کو، آزادی کے بعد تین بڑے رہنماؤں کی سالاری میں وہ جس طرح قائم رہا، آج بھی قائم رکھنے پر مصر ہوں۔ اس لئے مصر ہوں کہ اس کا وہ کردار جو آزادی کے فوراً بعد متعین ہو چکا اسے برقرار رکھا جائے تاکہ ملک ترقی کر سکے۔ اس ترقی کی دوڑ میں مسلمان اپنی پسماندگی اور جہالت کے سبب، ساتھ دینے کے بجائے بریک لگانے والے نہ بن جائیں۔ یہ مخصوص کردار سپریم کورٹ کے لطیفہ کے باوجود قائم ہے، اس لئے قائم ہے کہ قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے عدالتوں میں نہیں ہوا کرتے۔ ایسے فیصلے تو صرف قوم کا ضمیر کیا کرتا ہے۔ اور قوم کا ضمیر نہرو اور آزاد جیسے لیڈر کے بوتے نہیں۔ اور ان کی رہنمائی میں بدلتے ہوئے حالات میں، علی گڑھ کے روایتی کردار کا پورا پورا احترام رکھا گیا تھا؛ اور پھر ۱۹۵۱ء کے دس سال

بعد ۱۹۶۱ء میں اعلیٰ سطح کی چھڑجی انکوائری کمیٹی نے اِن روایات کے احترام پر مہر توثیق ثبت کردی تھی۔

یہ عجیب دلچسپ بات ہے کہ مسلم فرقہ پرست اور ہندو فرقہ پرست دونوں اس نقطہ پر متفق ہو گئے ہیں کہ ۱۹۵۱ء کا ایکٹ رد کر کے ایک بالکل نیا ایکٹ لایا جائے۔ وہ نیا ایکٹ کیسا ہو اس میں البتہ دونوں فرقہ پرستیاں اپنے اپنے طور سے رنگ بھرنے میں مصروف ہیں۔ دونوں کا موقف سمجھ میں بھی آتا ہے کہ اس کے سوا اور وہ کہہ بھی کیا؟ لیکن سب سے زیادہ تعجب مجھے اپنی نا عاقبت اندیش حکومت پر ہوتا ہے!

۱۹۵۱ء کا ایکٹ حکومت کے ایوان میں بھی ایسا ہی مردود ہے جیسے دونوں فرقہ پرستوں میں۔ اس ایکٹ کے بنانے میں جواہر لال نہرو، آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی دانشمندی، قوم پروری، دور اندیشی، ماضی کی تکریم، اور پھر مستقبل کی آرزومندی شامل تھی سیکولر جمہوریہ کی تعمیر بر تر ہیں ان عظیم دیوزادوں کو ٹھکرا کے بونوں کے ورثہ پر قناعت کیوں دَر پے ہو دوستو! اور کسی اور دھندے میں نہیں ہو تو اپنے آپ کو عظمت کے ان تین ستونوں سے بڑا ستون ثابت کرنے کے لئے کیا تمہارے پاس آزمانے کو صرف علی گڑھ ہی رہ گیا ہے؟ تم نے نئے ایکٹ، پراویژنل ایکٹ اور ملے جلے ایکٹ کی باتیں کیوں چھیڑیں جبکہ تمہارے لئے یہ کافی ہوتا کہ محض ایمرجنسی ایکٹ ختم کر دینے کا اعلان کر دیتے ۱۹۵۱ء آپ سے آپ بحال ہو جاتا۔ مسلم فرقہ پرستی اس راہ پر چلے تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ وہ نہرو کو میٹھی مار دینے والا چالاک ہندو، آزاد کو شوبوائے اور ذاکر حسین کو

'مردود' قرار دے چکے ہیں، اور ان کی قیادت تیزی سے تبلیغی اور اسلامی جماعتوں کے ہاتھوں میں جا رہی ہے۔ لیکن میں ان میں اور تم میں کیسے فرق کروں جب کہ وہ زبان سے کہتے ہیں، مگر تم تو عمل سے کہتے ہو۔

اور شورش یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں میں ترقی پسند اور روشن خیال عناصر کا فقدان ہے۔ ایک طرف اپنے عمل سے مسلم فرقہ پرستی کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے جاتے ہو اور دوسری طرف ہمیں مورد الزام ٹھہراتے جاتے ہو کہ ہم کچھ کر نہیں پاتے۔ ہمارے ہاتھ تو خود ہی باندھ دیتے ہو!

فخرالدین احمد سے کہا گیا کہ علی گڑھ پر ایک کمیٹی بناؤ۔ کمیٹی بنی جس میں ہمایوں کبیر، سیدین، علی ظہیر، محمود بیگ اور کون کون مسلمانوں کے اعلیٰ ترین مفکر اور ماہر تعلیم اور حکومت کے بھی معتمدین شامل تھے۔ ان سے رپورٹ طلب کی گئی۔ رپورٹ تیار ہوگئی تو اُسے اطمینان سے داخل دفتر کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ تو ۱۹۵۱ء ایکٹ سے بھی زیادہ لبرل ہوتی جاتی تھی درآنحالیکہ امر طے شدہ کچھ یوں تھا کہ ۱۹۶۵ء ایکٹ کے لگ بھگ ایمرجنسی جیسی صورت باقی رہنا چاہیئے! تو پھر آخر یہ سب تماشا کیا تھا؟

ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ اب جماعتی حلقے ۱۹۵۱ء کی بات ہی نہیں کرتے، صرف بیگ کمیٹی کے نعرے لگاتے ہیں۔ طلباء پر ایک طرف آپ کے رویہ کا ردعمل ہوتا جاتا ہے، دوسری طرف وہ حلقے انھیں اپنے بازوؤں میں سمیٹتے جاتے ہیں!

———

ڈاکٹر ذاکر حسین

علی گڑھ ------ اس کے بنانے میں ہندی مسلمانوں کی بہت کچھ محبت، محنت، دولت اور بہت کچھ جوش اور خلوص کام آیا ہے۔ اگر یہ قومی زندگی میں وہ رُتبہ حاصل کرلے جس کا میں، اور میں سمجھتا ہوں ہر مسلمان آرزومند ہے تو اس ملک میں مسلمانوں کے لیے باشرف اور باعزت شہریت کی ضمانت ہوجائے کہ جمہوریت میں امتیاز، شرف، خدمت اور خوبی ہی سے حاصل ہوتا ہے اور انھیں سے قائم رہتا ہے......

میرا تو یقین ہے کہ علی گڑھ کو قومی زندگی میں بڑا کام انجام دینا ہے، وہ کام ہندستانی تدبّر اور ہندستانی تعلیم، دونوں کا بنیادی کام ہے۔ یعنی ایک جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کرور مسلمان شہریوں کا حصّہ اور مقام! کتنا بڑا کام ہے، اور کیسا دل کش کام، یہ مختلف تمدنی اور تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام، جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین جمیل کل کی تشکیل میں مدد دے، ماضی کے سارے خزانوں کو چاہے کہیں سے آئے ہوں، ہر ہندستانی کی مشترکہ میراث بنا دینا، کہ سب ہمارے ہی گمشدہ لعل ہیں، سب کو ایک مشترک ماضی سے مالامال کرنا، سب کو مستقبل میں ایک جدوجہد

کا ولولہ بخشنا کوئی چھوٹا کام ہے؟ اس عزیز وطن کے ہر شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین اور ہندستانی زندگی کو صالح بنانے میں ان کا منصب، یہ ان پر ذمہ داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں، اور خدمت کا ایک نادر موقع پیش کرتے ہیں۔ یہ بیوفائی یا بے اعتنائی کا بہانا نہیں ہیں۔ کچھ چھوٹا کام ہے یہ؟

علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڑھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے خدمت کی جو پیش کش دے سکے گا، اس سے متعین ہوگا ہندستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام! اور ہندستان جو سلوک علی گڑھ کے ساتھ کرے گا اس پر، ہاں اس پر، بڑی حد تک منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔

جب دارالعلوم قائم ہوا تو وہ مسلمانانِ ہند کے لیے سخت ابتلا کا وقت تھا۔ غلامی کی زنجیریں پیروں میں ڈالی جا رہی تھیں، اور ایک تاریک دور کا آغاز تھا۔ سیاسی غلامی سے زیادہ خطرناک چیز قوم کی اپنی اخلاقی و روحانی پستی تھی، ذہنی جمود اپنی حد کو پہنچ گیا تھا۔ قوم کے قوائے ذہنی و اخلاقی مشل تھے، علم و دانش سے بیزاری تھی، اور سیرتِ حسنہ کا شیرازہ تار تار ہو چکا تھا، اس دورِ ابتلا میں اس پیرِ جواں ہمت سید احمد خانِ اعظم نے اس نیم مردہ قوم کو پھر سے تندرست و توانا بنانے، خوابِ غفلت میں سرشار قوم کو پھر سے بیدار کرنے کا قصد کیا، اسے سیاسی اقتدار واپس دلانے کی کوشش سے نہیں، بلکہ اس کے قوائے اخلاقی و ذہنی و روحانی کو فسردگی و فساد سے نکالنے اور صحت مند بنانے کی کوشش سے اس نے کہا،

'علم اور سیرۃِ حسنہ پر آئندہ قومی عظمت کی بنیاد رکھی جائے'!

یہ بڑی ہمت کا کام تھا، بڑا صبر آزما کام تھا۔ اس کے انجام دینے میں غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی۔ سب جانشینوں میں بانی کی سی فراست، اور بانی کا سا خلوص نہ رہا ہو تو تعجب کی بات نہیں، مگر کام کی بنا رخلوص اور نیک نیتی پر تھی، اس لیے باوجود وقتی لغزشوں کے یہ ادارہ اپنے بانی کے ارادوں کو پورا کرنے میں ساعی رہا۔ وطن کی آزادی میں اس کے تیار کیے ہوئے نوجوانوں اور بوڑھوں نے جو حصہ لیا وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد لوگوں کو گمان تھا کہ اس ادارے کا مستقبل بڑے خطرے میں ہے، الحمد للہ، یہ خیال بالکل بے بنیاد نکلا۔ مسلمانانِ ہند آج بھی دُنیا کی تیسری بڑی مسلم آبادی ہیں اور انھیں ایک آزاد جمہوریہ کے ذمہ دار شہری ہونے کا امتیاز و افتخار حاصل ہے۔ ان کی ترقی ہندستان کی ترقی، ان کی بدحالی، سارے ہندستان کی بدحالی ہے۔ ان کے سپرد اپنے ملک کی خدمت کی ذمہ داری ہے، اور ملک پر ان کی فلاح و بہبود کی کوشش فرض ہے۔

آزادیِ ہند کے بعد سے علی گڑھ کی روداد اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ گزشتہ عہد میں جب علی گڑھ پر انگریزی حکومت کی خاص نظرِ التفات بتائی جاتی تھی، سالانہ ساڑھے تین لاکھ کی امداد ملتی تھی؛ اور یہ مسلمانانِ ہند کی روح، اور ان کے ضمیر کی قیمت تھی؛ کیسی ارزانی تھی اس جنس کی!! آزادیِ ہند کے بعد سے حکومتِ ہند کی سالانہ امداد کا اوسط بیس لاکھ سے کم نہیں رہا ہے۔ نئے شعبوں کے کھولنے، نئے ساز و سامان کے فراہم کرنے، نئی عمارات بنوانے، کے لیے جو امداد

ہے، وہ اس کے علاوہ ہے۔ اور پچھلے سات سال سے زیادہ کے زمانے میں، جب سے میں وہاں ذمہ دار کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں، ایک واقعہ ایسا نہیں، جب حکومت نے کسی معاملے میں کسی قسم کی مداخلت کی ہو، یا ہدایت دی ہو، یا اعتراض کیا ہو! کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی بدخواہ نے حکومت سے کچھ کرنے کی خواہش کی ہے تو اس کو صاف جواب دیا گیا ہے کہ یونیورسٹی ایک خود مختار ادارہ ہے، حکومت اس کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتی!

یہ حال کسی غیروں کے ادارے کا نہیں ہو سکتا! مسلمانانِ ہند ہندی قوم کا ایک اہم جزو ہیں۔ ان پر قومی زندگی کے تمام فرائض عائد ہوتے ہیں، اور قوم سے اپنی ترقی و بہبودی کے وسائل لینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ آپ خوش ہوں گے کہ یہ فرض بھی پورا ہو رہا ہے اور یہ حق بھی ادا کیا جا رہا ہے۔

اس ادارے کی تاریخ ایک بڑی ذہنی تحریک کی تاریخ ہے، جمود ذہنی کو دور کر کے بیداری فکر کا ایک نیا دور شروع کرنے کی داستان ہے نامساعد و ناموافق حالات میں خلوصِ نیت اور سعیِ پیہم کی کامیابی کی کہانی ہے۔ ایک صحیح بنیادی خیال کے ارتقائی سفر کی روداد ہے کہ اگر اسے اچھے اور مستعد حامل مل جائیں تو وہ کیسے برابر آگے بڑھتا ہے اور کیسے نئی نئی تشکیلات میں اپنے کو پورا کرتا ہے، کیسے اس کے اس سفر میں کبھی کبھی غلط اور غیر ضروری عوارض دامنگیر ہوتے ہیں اور اسے اپنے مطالبوں کے تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کسی طرح اپنا دامن بچا کر نہیں گزر سکتا تو رفتہ رفتہ کس طرح اسے چھڑا کر اپنی مقدر

شاہراہ پر گامزن ہوتا ہے۔

ایک ایسے زمانہ میں کہ روایت کی غلط پاسداری جمود کا کامل رنگ اختیار کر چکی تھی، پرانے نظام جماعتی کی بنیادیں دھنس رہی تھیں، تعصب اور ہٹ پر ایک نئی زندگی کی تعمیر ناممکن تھی۔ جدید علم کے خزانوں کے دروازے ایک دستک پر کھلنے کے لیے آمادہ تھے اور ذہنی کاہلی تھی کہ ادھر قدم نہ بڑھانے دیتی تھی، انتشار جماعتی میں انفرادی اغراض نے جماعتی مصالح پر غلبہ پا لیا تھا، اور ہنرمندیاں اور ساری فضیلتیں، خودغرضیوں کی خدمت گزار اور معاون سمجھی جاتی تھیں۔ صالح فرد کے لیے صالح جماعتی زندگی کی ناگزیری کا احساس مفقود ہو گیا تھا، حوصلے پست تھے، ہمتیں شکستہ تھیں، توانائیاں مضمحل تھیں؛ ایک پیر جواں ہمت سید احمد خاں نے احیاء ملت کا تہیہ کیا اور اپنی کوششوں کا مرکز ایک تعلیمی ادارے کو بنایا، ایک بہت چھوٹے سے تعلیمی ادارے کو۔ ہوتے ہوتے یہ پودا ابھرا۔ اس کی اقامت گاہوں کی سارے ملک میں آسانی سے نظیر نہ ملتی تھی۔ اس کے کھلاڑیوں نے نام پیدا کیا، اس کے طلباء کے چال چلن، سلیقہ مندی معاملہ فہمی کی شہرت عام ہو گئی۔ علی گڑھ کا طالب علم اپنی سج دھج اپنے طور طریقے سے سارے ملک میں پہچان لیا جاتا تھا۔ اس تعلیم گاہ کے کام میں ملک کے سیاسی حالات نے، حکمراں قوم کی مخصوص مصلحتوں نے رخنے ڈالے، پیچیدگیاں پیدا کیں اور اس کی ڈگر عام شاہراہ سے الگ ہو گئی۔ لیکن اسی ادارہ کے طالب علم تھے جنھوں نے ۱۹۲۰ء کی سیاسی آزادی کی تحریک کو اپنی انتھک اور بے لوث کوششوں سے وہ توانائی بخشی جو تحریک آزادیِ ہند میں آخری منازل تک کسی نہ کسی روپ میں کارفرما

رہی۔ اس زمانہ میں کالج یونیورسٹی کے درجہ کو پہنچا۔ اور اسی زمانہ میں اس سے الگ ہوکر مگر اس کی اصلی روح کو اپنے اندر لئے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا، جس نے ملک کے تعلیمی فکر پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ یونی ورسٹی ابتدائی انتشاری دشواریوں کے بعد برابر بڑھتی گئی۔ نئے نئے شعبے کھلتے گئے۔ طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء میں اعلان آزادی اور تقسیم ملک سے پہلے طلباء کی تعداد اور تعلیمی و تربیتی انتظامات میں ایک ناموافق نسبت پیدا ہوگئی تھی۔ جس کا اثر کام کے معیار پر بہت مضر پڑا۔ یوں بھی سیاسی بحران کا زمانہ تھا اور یونیورسٹی کے لیے بڑا نازک زمانہ تھا۔ تقسیم کے بعد اس کے جو نتائج رونما ہونے لگے وہ ایسے تھے کہ لوگ اس دارالعلوم کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چلے تھے۔ اس کے وجود کے قائم رہنے کو مشتبہ سمجھا جانے لگا تھا۔ طلباء کی تعداد یکایک کم ہوگئی تھی۔ بہت سے اساتذہ پاکستان چلے گئے تھے۔ مالی امداد کے وسائل کم ہوگئے تھے۔ فیسوں کی آمدنی گھٹ گئی تھی۔ عطیوں سے آمدنی ختم ہو چکی تھی اور یونیورسٹی مجبور ہوگئی تھی کہ پچھلی خوشحالی کے زمانہ میں جو کچھ پسماندہ جمع کیا تھا اسے کام میں لے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ وقت بھی گزر گیا۔ وقت کی بڑی خوبیوں میں سے یہ بھی ہے کہ گزر جاتا ہے، اور آج اگر ہم (پچھلے برسوں پر) نظر ڈالیں تو مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی !!

▲

فخر الدین احمد کمبیٹ

وزیراعظم مسز گاندھی نے مسلم وزیر فخرالدین علی احمد کو علی گڑھ کے سلسلہ میں مجاز کر دیا اور انھوں نے پورے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے علی ظہیر، ہمایوں کبیر ہمیدین، عبدالرحمٰن خاں شروانی، جسٹس خلیل احمد، جسٹس بشیر احمد، پروفیسر ایم ایم بیگ اور ظفر احمد صدیقی پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی کمیٹی نے ستمبر ۶۸ء میں اپنی سفارشات مسلم وزیر کو پیش کر دیں۔

یہ سفارشات اس قدر مسلمان قسم کی تھیں کہ مسلمان وزیر نے بہتر سمجھے کہ اسے داخل دفتر کر دیا جائے۔ اس کے بجائے وزیر تعلیم ڈاکٹر راؤ نے غالباً ان کے مشورے ہی سے ایک نیا عبوری بل ۳۱ راگست ۷۰ ۱۹ء کو راجیہ سبھا میں پیش کر دیا۔ یہ عبوری یا عارضی اس لئے تھا کہ دسمبر میں ہونے والی جبلی خوشدلی سے منائی جا سکے۔ لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ بل اس قدر غیر جمہوری تھا کہ محض اسی کے سبب جبلی ہی کو ملتوی ہونا پڑا۔

اس فخرالدین کمیٹی (جسے بیگ کمیٹی بھی کہتے ہیں) کی سفارشات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں کم سے کم مداخلت کی جائے۔ صرف ایسی ترمیمات کی جائیں جن کا کیا جانا اشد ضروری ہو۔ یکساں قانون بنانے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ یونیورسٹی کی اصل قیمت اس کا مخصوص کردار ہے۔

۲۔ ایکٹ کی دفعہ ۱ میں حسب ذیل ضمنی دفعہ (۲) بڑھائی جائے۔

"باوجود کسی عدالتی فیصلہ، ڈگری یا آرڈر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمان اقلیت کی قائم کردہ سمجھی جائے گی اور اس کا نظم و نسق

دستور کی آرٹیکل ۲۹ - ۳۰ کے مطابق ہوگا۔"

(مندرجہ بالا سفارش پوری رپورٹ کی روح کی حیثیت رکھتی ہے سپریم کورٹ کے فیصلہ اور ۱۹۶۵ء کے بعد سے مرکزی حکومت کے طرزِ عمل نے مسلم یونیورسٹی کے حقیقی کردار کے بارے میں جو شکوک پیدا کر دیئے ہیں، ان کے پیشِ نظر یونیورسٹی ایکٹ میں اس کی وضاحت ضروری ہوگئی۔ اس قسم کی وضاحت کوئی نئی بات نہیں، ہائی کورٹ کے فیصلوں کے بعد مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے بار بار اصل قانون میں اس قسم کی دفعہ کا اضافہ کیا ہے۔)

۳- کمیٹی نے تیسری اہم سفارش دفعہ ۱۲ الف کے سلسلہ میں کی تھی۔ مجوزہ بل میں یونیورسٹی کو اختیار دیا گیا تھا کہ ۱۵ میل کے اندر کے کالجوں یا تعلیمی اداروں کا الحاق کر سکتی ہے، یا انھیں یونیورسٹی کے مراعات کا مستحق قرار دے سکتی ہے۔

کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ دفعہ ۱۲ الف منسوخ کر دی جائے، اس سے یونیورسٹی کا اقلیتی و اقامتی کردار ختم ہو جائے گا۔

۴- مجوزہ بل میں وزیر کے اختیارات میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا گیا تھا کمیٹی نے ان کو کم کرنے کی سفارش کی تھی۔ وائس چانسلر کی تقرری کے سلسلہ میں بھی کمیٹی نے مثبت سفارشات کی تھیں۔

۵- دفعہ کی رو سے یونیورسٹی کے عہدیداران (وائس چانسلر، چانسلر وغیرہ) کسی بھی فرقہ کے ہو سکتے تھے۔ کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے پیشِ نظر یہ صحیح نہیں ہے یونیورسٹی کے عہدیداران مسلمان ہی ہونے چاہییں۔

۶- مسلم یونیورسٹی کورٹ کی تشکیل کے بارے میں کمیٹی نے بدلے ہوئے حالات

کے پیش نظر اس پر اصرار نہیں کیا تھا کہ کوئی غیر مسلم کورٹ کا ممبر نہ ہو۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی نمائندگی کو بھی مان لیا تھا، مگر کمیٹی نے یونیورسٹی کورٹ کی تشکیل کے سلسلہ میں جو تجویز پیش کی تھی اس میں اس بات کو ملحوظ رکھا تھا کہ ہر حال میں یونیورسٹی کورٹ میں غلبہ مسلمانوں کے نمائندوں کا رہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی تشکیل کے سلسلہ میں کمیٹی نے علاوہ دیگر چیزوں کے حسب ذیل سفارشات بھی کی تھیں۔

(الف) رجسٹرڈ گریجویٹس کے ۱۵ نمائندے

(ب) اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ۲۵ نمائندے

(ج) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تین نمائندے یونیورسٹی کورٹ میں لئے جائیں۔

(د) اس کے علاوہ کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ریاستی مجالس قانون ساز کے ۱۶ نمائندے لئے جائیں، جن کو مسلمان ممبران اپنے میں سے منتخب کریں۔ اس کے لئے پورے ملک کو چار منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر منطقہ کے ۴ ممبر ہوں۔

پانچ ممبرانِ پارلیمنٹ جنھیں مسلمان ممبرانِ پارلیمنٹ اپنے میں سے منتخب کریں، لیے جائیں۔

کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ اگزیکیٹو میں کورٹ کے منتخب کردہ اراکین ۸ ہونا چاہئیں جو یونیورسٹی کے ملازم نہ ہوں۔

(تلخیص: ظفر احمد صدیقی)